سہ ماہی
ادبی محاذ
کٹک
اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء
OCT-DEC 2016
Vol-1 Issue-3
مدیر سید نفیس دسنوی
گوشۂ سید شکیل دسنوی

بیادِ پروفیسر سید منظر حسن دسنوی مرحوم
اور سید شکیل دسنوی مرحوم
شعر و ادب کی صالح قدروں اور عصری رجحانات کا ترجمان
سہ ماہی **ادبی محاذ** کٹک

اشاعت کا بارھواں سال	۴۹ رواں شمارہ

سر پرست: انجینئر سید آصف دسنوی
مدیر اعلیٰ: سعید رحمانی
موبائل۔ 07735860991 (صرف SMS کے لیے)
08763623951 (برائے SMS)

مدیر
سید نفیس دسنوی
Mob:9437067585

معاون مدیر
سیّد نورالٰہی ناطق
Mob:9237427933

منیجنگ ایڈیٹر
سمیع الحق شاکر موبائل 9861148800
کمپیوٹر کمپوزنگ:۔ سید مصطفیٰ علی موبائل۔ 8984218600

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
سعید رحمانی، اخبار اڑیسہ پبلی کیشنز، دیوان بازار، کٹک۔ 753001 (اڈیشا)
09437067585 (ضروری جانکاری کے لیے)
E-mail: adbi.mahaz@gmail.com
E-mail: Sayeedrahmani@gmail..com
Website: www.adbimahaz.yolasite.com

قیمت فی شمارہ: ۲۵ روپے زرِ سالانہ: ۱۰۰ روپے
رجسٹری ڈاک سے زرِ سالانہ۔ ۱۸۰ روپے
خصوصی زرِ سالانہ: ۲۰۰ روپے بیرونِ ممالک: ۲۵ امریکی ڈالر
(چیک یا ڈرافٹ پر نام کی جگہ صرف Md.Sayeed لکھیں۔ پتہ نہ لکھیں۔ چیک کے ذریعہ زرِ سالانہ ۱۲۵ روپے ارسال کریں۔ بیرونِ ملک کے لئے ۳۰ امریکی ڈالر)
IndianOverseasBank-A/CNo.172201000001688
IFSC Code-IOBA0001722-Branch-HaripurRoad,Cuttack
عدالتی چارہ جوئی صرف کٹک کی عدلیہ میں قابلِ سماعت ہوگی
مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

پبلیشر و پرنٹر شیخ قریش نے چتّا پریس قاضی بازار سے چھپوا کر دیوان بازار کٹک سے شایع کیا

یادوں کی دہلیز سے
سید شکیل دسنوی مرحوم

غزل
(غیر مطبوعہ)

ہم تو سیّد یہاں کے تھے ہی نہیں
''دھوپ تھے سائباں کے تھے ہی نہیں''
خود کفِ پا نے رہنمائی کی
ہم کسی کارواں کے تھے ہی نہیں
توڑ بیٹھے ہیں پیاس سے رشتہ
ہم فراتِ رواں کے تھے ہی نہیں
زندگی نے تو ہم کو اپنایا
ہم مگر اس جہاں کے تھے ہی نہیں
ہم سے وحشی ہوا کا کیا قصہ
ہم کسی بادباں کے تھے ہی نہیں
یوں ہوئے ہیں زمیں نشیں جیسے
ہم کبھی آسماں کے تھے ہی نہیں

بشکریہ
سید مدثر حسن (حیدرآباد)

ہمارے خصوصی معاونین

اپنی پنشن کی رقم سے ''اخبارِاڑیسہ'' کالگایا ہوا پوداب اللہ کے فضل وکرم سے برگ وبار لا کر سہہ ماہی ''ادبی محاذ'' کی صورت میں ارتقائی سفر طے کرنے لگا ہے۔میری تنہا ذاتی کوششوں سے شروع کیا ہوا یہ سفراب 'لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا' کے مصداق ایک ادارے کی شکل اختیار کر گیا ہے جس میں مقامی احباب کے دامے درمے سخنے تعاون کے ساتھ ہی کل ہند سطح پر دیگر محبان اردو نے اپنی طرف سے ایک ہزار سے لے کر پانچ ہزار تک کے عطیات دیے ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ان میں سے بعض نے وقفے وقفے سے رقم بھیجتے رہنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔تمام محبان اردو سے نہ صرف کل ہند بلکہ عالمی سطح پر بھی لائف ممبر شپ قبول کرنے کی گزارش ہے۔

خصوصی معاونین کے اسمائے گرامی

نام	مقام
الحاج محمد ایوب خاں	بھوبنیشور
الحاج سیّدعطامحی الدین	بھدرک
الحاج سیّدڈاکٹر مشتاق علی	کٹک
الحاج مولوی سیّدنذیرالدین صدیقی (ایڈوکیٹ)	کٹک
جناب محمد شاہنواز	بھوبنیشور
جناب سہیل اختر	بھوبنیشور
جناب عبدالمجید فیضی	سمبل پور
جناب ایم اے احد	بھوبنیشور
جناب محمد اسلم غازی	ممبئی
جناب سیّدعلی شبنم کارواری	تھانے
ڈاکٹر محمد قمرالدین خاں	کٹک
جناب ایس این شیخ	ممبئی
مولوی محمد مطیع اللہ نازش	کٹک
جناب شیخ منوراحمد حبیبی	دھام نگر (اڑیسہ)
جناب محب الرحمٰن وفا	یوڈا،مہاراشٹر
جناب وکیل نجیب	ناگپور
جناب سیّدمحمودرضی الدین	راجستھان
جناب اقبال سلیم۔	بنگلور
جناب ایم حمیدالدین ناز	بیدر
پالوجی ڈاکٹر جاوید حسین	ممبئی
مس انجم ممتاز سلطانہ	بیدر
جناب رفیق شاہین	علی گڑھ
جناب سمیع الحق شاکر۔	کٹک
ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن بزمی	رانچی
ڈاکٹر جمال الدین احمد	بھوبنیشور
ڈاکٹر کرشن بھاوک۔	پٹیالہ
سید فرید منظر حسن۔	کٹک
ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی	نیپال
ڈاکٹر قمرالزماں۔	دھنباد
جناب بی۔ایس۔جین جوہر	میرٹھ
مولانا پھول محمد نعمت رضوی	مظفر نگر (بہار)
جناب ارشد قمر	ڈالٹن گنج
ڈاکٹر ملکہ خورشید	لکھنؤ
حاجی اختر حسین	بیل پہاڑ۔جھارسوگڈا
جناب جمال قدوسی	سدھارتھ نگر (یوپی)
جناب شمس الحق شمس (ایڈوکیٹ)	دیوپور (کٹک)
ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری	کٹک
ابوالکمال ظفر احمد (ایڈوکیٹ)	بالیسر
جناب ارشد جمیل	کٹک
جناب شیخ بشیر احمد	کشمیر
جناب نظام مجھولیاوی	مظفر پور (بہار)
جناب رمیش پرساد کنول	پٹنہ
جناب اسحاق عابد	چنئی
ڈاکٹر مختار شمیم	بھوپال
بانومہر سلطانہ بنت حمیدالدین	بیدر (کرناٹک)
جناب جاوید ندیم	ممبئی
جناب فیروز احمد سیفی	نیویارک (امریکہ)
پروفیسر سید محمد استخارالدین	بجنور (یوپی)

ایک ضروری تصحیح

گزشتہ شمارے کے صفحہ ۳۵؍ پر اوج اکبر آبادی کے نام سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس کے اصل مضمون نگار کا نام اوج اکبر پوری ہے۔قارئین تصحیح فرمالیں۔اس غلطی کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے

ادبی محاذ کے گوشے

ہر شمارے میں کسی نہ کسی شاعر یا ادیب کا گوشہ اہتمام سے شائع کیا جاتا ہے اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔اس میں نوآموز اور معروف قلمکاروں کی کوئی قید نہیں ہے۔
آپ بھی چاہیں تو اس ادبی گوشے میں شرکت کر سکتے ہیں۔تفصیل کے لیے اس فون نمبر پر رابطہ کریں۔نمبر ہے:09437067585

اس شمارے میں

قاضی مشتاق احمد
B-6,Ray-venueSociety
I.C.SColony.GaneshKhind-411007

محاذِاول

کیا یہی ''راج دھرم'' ہے؟

مشہور فلم اسٹار عامر خان کو دھمکانے کے سبب وزیر دفاع منوہر پاریکر تنقیدوں کی زد میں آگئے ہیں۔ یاد رہے کہ عامر خان نے ملک میں عدم تحمل کے سلسلے میں کہا تھا کہ ''اس کی وجہ سے ان کی شریک حیات کرن فکر مند رہتی ہیں اور کبھی کبھی ملک چھوڑنے کی بات بھی کرتی ہیں''۔ پاریکر نے ایک پروگرام میں دھمکی آمیز لہجہ میں کہا تھا کہ ''میں صرف اشارہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اگر کوئی ایسا کہے گا تو اسے زندگی بھر کے لئے سبق سکھایا جانا چاہیے۔'' اس کے ساتھ منوہر پاریکر نے اعتراف کیا کہ ایک ٹیم نے ''اسٹیپ ڈبل'' کے خلاف مہم چھیڑ رکھی ہے جس کی بنا پر اسٹیپ ڈبل نے عامر خان کے ساتھ اپنے معاہدے کی تجدید نہیں کی ہے۔ عامر خان کو نشانہ بنانے پر کانگریس کے سرجے والا نے کہا کہ ''یہ شرمناک بات ہے کہ وزیر دفاع صحیح جگہ پر بندوق تاننے کے بجائے ایک اداکار کو سبق سکھانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔'' پاریکر کا یہ بیان ثابت کرتا ہے کہ مخالفت میں اٹھنے والی تمام آوازوں کو دبانے اور دلتوں اور مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کی مسلسل ایک پالیسی ہے۔ کانگریس ترجمان نے سوال کیا ہے کہ ''کیا یہی دھرم راج ہے''؟۔ منوہر پاریکر کا شمار سنجیدہ قسم کے سیاستدانوں میں ہوتا ہے۔ ملک کو ان سے بڑی امیدیں بھی ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ وہ وزیر دفاع کی حیثیت سے ملک کو بیرونی جارحیت سے محفوظ رکھنے اور دہشت گردوں کو ان کی دھمکیوں کا جواب دینے کی بجائے عامر خان جیسے وطن دوست کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ عامر خان کا تعلق مولانا آزاد کے خاندان سے ہے، جس خاندان نے ہمیشہ وطن دوستی کی مثالیں قائم کیں۔ عامر خان نے بے مثال فلمیں بنا کر وطن عزیز کا نام روشن کیا۔ سرجے والا کا یہ انکشاف چونکا دینے والا ہے کہ ''بی جے پی کے حامیوں نے سرگرم رول ادا کرتے ہوئے عامر خان کے معاملے میں اسٹیپ ڈبل کو نقصان پہنچایا''۔ یہ یقیناً کسی اسکینڈل سے کم نہیں۔

دوسری طرف جانوروں کے تحفظ کے نام پر خود ساختہ ''گئو رکھشک'' مسلمانوں اور دلتوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے قانون کو ہاتھ میں لے رہے ہیں۔ ایک مشہور ٹی وی چینل نے اپنے خفیہ کیمرہ کی وجہ سے یہ انکشاف کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے کہ آخر کس طرح ان لوگوں کو من مانے طریقہ سے کام کرنے دیا جا رہا ہے۔ این ڈی ٹیوی کی ایک ٹیم خفیہ کیمرہ لے کر ٹرک ڈرائیور اشفاق قریشی کے ٹرک کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے پیچھے پونے سے ستارا کے لئے نکلی۔ اس ٹرک میں قریشی دس بھینسوں کو واپس لے جا رہا تھا جو نہیں بکی تھیں۔ ٹرک میں موجود بھینسوں کو سرکاری منڈی اور جہاں سے انھیں خریدا گیا تھا وہیں سے بانجھ قرار دینے کا سرٹیفکٹ تھا۔ مہاراشٹر کے قانون میں بانجھ اور کمزور بھینسوں کو آمد و رفت اور ذبح کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ پونے سے قریب ایک گھنٹے کے فاصلے پر ساسود گاؤں میں گئو رکھشک بھیڑ نے ٹرک روک لیا۔ اس بھیڑ کی قیادت ایک نوجوان کر رہا تھا جس نے اپنی شناخت ایک ہندو تنظیم ''سمست ہندو اگھاڑی'' کے رکن سبھاش تیازے کے طور پر بتائی۔ انھیں اس ٹرک کی اطلاع پنڈت پرسورام نے دی تھی جو فیس بک کے مطابق گئو رکھشک ہے اور ۴۰ سال تک بی جے پی اور آر ایس ایس کے لئے کام کرتا رہا ہے۔ سوامی نامی ایک شخص نے پولیس کو فون پر ٹرک کے بارے میں اطلاع دی کہ اس میں گائے اور بیل لے جا رہے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ سوامی کا فون آنے کے بعد پولیس نے ڈرائیور قریشی کے خلاف جانوروں کے خلاف مظالم کی دفعات کے تحت مقدمہ درج کیا اور جانوروں کو ''باڑے'' میں بھیج دیا۔ کہا جاتا ہے کہ پونے کے علاقے میں شیوشنکر سوامی نامی ایک شخص جس پر کئی مقدمات درج ہیں جانوروں کے باڑے چلاتا ہے اور اسی کے فون پر پولیس نے یہ کارروائی کی اور قریشی کو گرفتار کر لیا۔ حالانکہ اس کے پاس تمام ضروری کاغذات، طبی بکس، پانی چارا سب کچھ تھا، لیکن پولیس نے صرف سوامی کی بات ہی سنی بلکہ ایف آئی آر تیار کرنے میں گئو رکشک پولیس تھانے میں نظر آئے۔ (حوالہ انقلاب)

''بیف'' کے نام پر انسانی جانوں سے کھلواڑ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دلت بھائی بھی آر ایس ایس کے نشانے پر ہیں۔ بیف کے نام پر مدھیہ پردیش کے مندسورا اسٹیشن پر مسلمان خواتین کی بے رحمانہ پٹائی، دادر میں اخلاق احمد کا قتل، کشمیر اسمبلی میں مسلم ایم ایل اے کی پٹائی، مین پوری کا واقعہ، سہارن پور میں ایک نوجوان کو مار مار کر ہلاک کرنا، فرید آباد میں چار دلتوں کو زندہ جلا دینا، گجرات میں مردہ جانور کی کھال نکالنے والے زندہ دلتوں کی کھال ادھیڑ دینا۔ دلت اسکالر روہیت یمولا کی موت، ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور دلتوں کو کسی نہ کسی بہانے ستایا جا رہا ہے۔

بی جے پی کے زیر اقتدار ریاست مدھیہ پردیش میں گئو کشی کے نام پر دو مسلمان خواتین کی پٹائی کا معاملہ لوک سبھا میں گونجا۔ ملک ارجن کھڑگے نے حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی اور کہا کہ گئو رکھشا کے نام پر مسلمانوں، دلتوں اور خواتین کو کس طرح نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ آر ایس ایس اور بی جے پی کے لوگ گائے کے نام پر اپنے

ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔کھڑگے کی حمایت میں ترنمول کانگریس اور بایاں محاذ کے اراکین کھڑے ہوگئے اور مودی حکومت کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے احتجاجاً واک آوٹ کر گئے۔

احمد آباد میں دلتوں کی عظیم ریلی جسے ''مہا سمیلن'' نام دیا گیا تھا اس میں ۱۲؍ ہزار مظاہرین نے شرکت کی، ریلی میں مسلمانوں کی خاصی تعداد واضح نظر آ رہی تھی۔مظاہرین کا مطالبہ تھا کہ حکومت انھیں اپنے تحفظ کے لئے اسلحہ رکھنے کا لائسنس فراہم کرے کیونکہ حکومت ان کے تحفظ میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔اس مظاہرہ میں مسلمان بھی دلتوں کے شانہ بشانہ تھے اور کم از کم تین مسلم لیڈر اسٹیج پر نظر آئے۔واضح رہے کہ ریاست میں آئندہ سال اسمبلی الیکشن ہونا ہے۔گجرات میں دلت سات فیصد اور پٹیل ۱۰؍ فیصد ہیں۔گجرات اوراونا میں دلتوں کی پٹائی کا معاملہ سامنے آنے کے بعد بی جے پی کے دلت لیڈر بابو پنڈوا ڈرانے اپنے ۲۰۰؍ حامیوں کے ساتھ پارٹی کی بنیادی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔دوسری طرف حیدر آباد سے تعلق رکھنے والے رکن اسمبلی راجا سنگھ نے اونا کے واقعہ کو درست ٹھہراتے ہوئے دلتوں کو ''غلیظ'' کہا اور ان کی پٹائی کو جائز قرار دیا اور آئندہ سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ ؎

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی۔کسے وکیل کریں؟ کس سے منصفی چاہیں؟

گجرات کے فسادات کے بعد اٹل بہاری واجپائی نے اس وقت کے گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو ''راج دھرم'' نبھانے کا مشورہ دیا تھا۔اب واجپائی مشورہ دینے کی حالت میں نہیں ہیں۔ ؎ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

☆☆☆

محاذِ ثانی

اپنی بات

ادبی محاذ کا تازہ شمارہ پیشِ خدمت ہے۔اس بار اشاعت میں اس لیے تاخیر ہوگئی کہ ہمارے مدیرِ معاون جناب سید نورالٰہی ناطق حرمین شریفین کی زیارت اور حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔خوشی کی بات ہے کہ حج کی سعادت حاصل کر کے وہ بخیرت وسلامت وطن لوٹ چکے ہیں۔اس سعادت کی حصولی پر ادارہ انھیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔خود ناچیز بھی نجی اور ہنگامی ضرورت کے تحت کولکاتا اور ممبئی کے اسفار کے دوران مہینوں باہر رہا۔۱۰؍۱ اکتوبر کو واپسی ہوئی تو رسالے کو فائنل ٹچ دینے میں مصروف ہوگیا۔خدا کا شکر ہے کہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر اب آپ کے ہاتھوں تک پہنچ گیا ہے۔

اس بار اپنے برادرِ اکبر حضرت سید شکیل دسنوی (مرحوم) کا گوشہ بطور خراجِ عقیدت شامل ہے۔موصوف کی ادبی خدمات اس قدر بسیط ہیں کہ اس مختصر سے گوشے میں سبھوں کو سمونا ممکن نہ تھا۔اس لیے ان کی حیات اور کارناموں کے بہت سے روشن پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔یہ گوشہ پیش کر کے میں سمجھتا ہوں کہ حق تو یہ ہے حق ادا نہ ہوا۔موقع ملا تو مستقبل میں پورا رسالہ ان کے نام معنون رہے گا۔بہرحال گوشہ آپ کے سامنے ہے۔مطالعہ کے بعد اپنی گرانقدر آرا اور مفید مشوروں سے ضرور نوازیں۔اس گوشہ کو معنوی خدوخال عطا کرنے میں جن قلمکاروں نے ہمیں قلمی معاونت سے نوازا ادارہ ان سبھوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہے اور امید کرتا ہے کہ آئندہ بھی وہ اپنی نگارشات سے نوازتے رہیں گے۔

غزلوں کا حصہ حسبِ معمول اس بار بھی بھاری ہے۔اس لیے حفظِ مراتب کا خیال نہیں رکھا جا سکا۔اس فروگذاشت کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔ہم نے یہ سوچ کر طرحی مشاعرے کے کالم کا آغاز کیا تھا کہ قارئین اس میں دلچسپی لیں گے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کریں گے۔مگر بتدریج ان کی تعداد گھٹنے لگی ہے۔پہلے بیس پچیس شعرا شامل ہوجاتے تھے۔اس بار مشکل سے دس بارہ ہی شریک ہو پائے ہیں۔اگر یہی حال رہا تو ہمیں اس کالم کو بند کرنا پڑے گا۔طرحی مشاعرے کی افادیت سبھوں پر عیاں ہے۔اس کی بدولت جہاں مشقِ سخن کا موقع ملتا ہے وہیں نوآموز شعرا کی ذہن سازی بھی ہوتی ہے۔اس میں شرکت کے لیے کوئی قید نہیں ہے۔جو ادبی محاذ کے خریدار نہیں ہیں ان کے لیے بھی دروازہ کھلا ہے اور وہ شوق سے اس میں شرکت کر سکتے ہیں۔شعرا نے اگر اس میں دلچسپی لی تو آئندہ عمدہ طرحی غزل پر انعامات دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔

سید نفیس دسنوی

حمد و نعت

علیم صبا نویدی

26/34 امیر النسا بیگم اسٹریٹ۔ چنئی۔۲

دھڑکنوں کو نور دینے والا تو
سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ تو
تیرے آگے سجدہ زن یہ کائنات
دین و دنیا کا ہے محور تیرے ہات
جسم و جاں کی ڈور تیرے ہاتھ میں
تیرا پرتو دھوپ میں برسات میں
نور تیرا ذرّے ذرّے پر محیط
ذات تیری ساری دنیا پر محیط
کیا ثنا تیری ہو ربِ ذوالجلال
تیرے الطاف وعطا ہیں بے مثال
رحمتیں تیری ہیں ہر سو بے شمار
تجھ سے ضو لیتے ہیں یہ لیل ونہار
دامنِ رحمت میں تیرے دو جہاں
تو ہی تو ہے چار سو جلوہ فشاں
تو ہی تو ہے واقفِ رمزِ حیات
تو ہی تو ہے نورِ ربِ کائنات

انجم باروی

آئی۔۹۲؍رامیشور پور روڈ۔کولکاتا۔۷۰۰۰۲۴
موبائل۔8100116443

ذرّے ذرّے میں تو ہے نہاں
تیری قدرت تو ہے بیکراں
یہ زمیں اور یہ آسماں
ہیں ترے فن کی رعنائیاں
ہے تو خلّاقِ ہردوجہاں
تو عیاں بھی ہے تو ہے نہاں
میرے دل میں ہے تو ضوفشاں
حمد سے تیری قاصر زباں
برگِ گل اور یہ گلستاں
ہیں تری رحمتوں کے نشاں
تجھ سے ہے میری یہ التجا
بخش دے اے خدائے جہاں

☆

غلام مرتضٰی راہیؔ

راہی منزل۔۱۳۵؍ پنی۔فتح پور۔۲۱۲۶۰۱
موبائل۔9236590822

پل پل کی میں روداد رقم کرتا چلا جاؤں
صدیوں کے لیے خود کو بہم کرتا چلا جاؤں
اٹھ کر ترے در سے مجھے جانا ہو کہیں بھی
محسوس ترا لطف و کرم کرتا چلا جاؤں
رکّھے مجھے توفیق سبک بار ہمیشہ
احسان کو احسان میں ضم کرتا چلا جاؤں
ٹھہروں ترے نزدیک میں کردار کا غازی
پورے میں سبھی قول وقسم کرتا چلا جاؤں
دنیا سے مرا فاصلہ بڑھتا رہے چاہے
تجھ سے جو ہے دوری اسے کم کرتا چلا جاؤں
دریا کی خوشامد نہ کروں پیاس کے ہوتے
ہونٹوں پہ زباں پھیر کے نم کرتا چلا جاؤں

سالک بستوی

جمعیت الاصلاح، غوری۔ ڈاکخانہ باگھا
بازار۔ضلع سدھارتھ نگر۔۲۷۲۲۰۲

نہ یہ دھرتی نظر آتی نہ دلکش آسماں ہوتا
مخالف اپنے بندوں کا اگر ربِ جہاں ہوتا
مسرت کامرانی کی تجھے اپنا بنا لیتی
اگر جذبِ عقیدت تیرے چہرے سے عیاں ہوتا
جو خیرالرازقیں روزی کے در کو بند کر دیتا
کہو وہ دیوتا ہے کون جو روزی رساں ہوتا
ہمیشہ دور رہتا وہ خمارِ شرک و بدعت سے
اگر توحید کا دیپک جگر میں ضوفشاں ہوتا
نہ ہوتا زلزلہ کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا
مصیبت ٹالنے والا اگر سائنس داں ہوتا
خدا کی یاد اے سالکؔ کسی دل میں نہیں بستی
اجل کو روکنے والا جو کوئی پہلواں ہوتا

حسیب الرحمٰن حسیب

دلاور گنج۔راجگا نگ پور۔ضلع سندر گڑھ (اڑیشا)

اے عشق مجھے لے چل اک بار مدینے میں
رہتے ہیں غریبوں کے غم خوار مدینے میں
یارب میری قسمت میں کچھ ایسا سفر لکھ دے
مکے میں کروں سحری افطار مدینے میں
سرکار کے قدموں کی برکت اسے کہتے ہیں
پاتا ہے شفا جاکر بیمار مدینے میں
جاتا ہے وہاں جو بھی کرتا ہے ہراک لمحہ
اللہ کے جلووں کا دیدار مدینے میں
برسوں سے میرے دل میں بس ایک تمنا ہے
آقا کو سناؤں کچھ اشعار مدینے میں

انجنا کشش

لکچرار اردو۔جی جی آئی سی۔۱۵۶؍سول لائنس۔نزد مہیلا
ڈگری کالج۔فتح پور (یوپی) Mob-945035391

مدینے کے گل و گلزار دیکھوں
نظر سے روضۂ سرکار دیکھوں
تمنا ہے یہی بس دل کی میرے
کبھی گنبد کبھی مینار دیکھوں
ابھرتی ہے مرے دل میں یہ خواہش
میں طیبہ کے درو دیوار دیکھوں
کبھی بیدار آنکھوں سے میں اپنی
زمینِ بطحا کے انوار دیکھوں
تڑپ ایسی میرے دل میں سمائے
رسولِ پاک کا دربار دیکھوں
خیالوں میں نبی کا آستاں ہو
ہمیشہ ان کا میں دیدار دیکھوں
نظر میں ہو مری طیبہ کا منظر
کششؔ سپنا میں یہ ہر بار دیکھوں

میکش اجمیری

موتی بازار۔نماہیڑہ۔راجستھان۔۳۱۲۶۰۱
موبائل۔9352761152

کر آیے عرش کا جو سفر آپ ہی تو ہیں
سرکار! جستجوئے نظر آپ ہی تو ہیں
حاصل شرف ہے ہم کہ امت ہیں آپ کی
رب کے حبیب فخرِ بشر آپ ہی تو ہیں
رہتا ہوں آپ ہی کے تصور میں رات دن
آباد جس سے دل کا ہے گھر آپ ہی تو ہیں
ہم پر نہیں ہے شدتِ آلام کا اثر
جس کے ہیں سائے میں وہ شجر آپ ہی تو ہیں
ہم جارہے ہیں منزلِ مقصود کی طرف
تاباں ہے جس سے راہ گزر آپ ہی تو ہیں
میکشؔ ہے ذرّہ اس کو بھی کر دیجے آفتاب
حق ہے کہ تابِ شمس وقمر آپ ہی تو ہیں

گوشۂ احباب

(مراسلہ نگار سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کے۔ڈی۔خان (اجمیر)

اپنا تعارف کیا خاک کراؤں۔

میں وہ وقت ہوں جو گزر گیا میں وہ چیز ہوں جو نبٹ گئی
میں وہ پچھلی رات کی نیند ہوں جو اچٹ گئی تو اچٹ گئی

'ادبی محاذ' کا شمارہ اپریل تا جون ۲۰۱۶ء قسمت سے مجھے مل گیا ورنہ ڈاک کا انتظام اتنا بگڑا ہوا ہے کہ سوائے کفِ افسوس ملنے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس میں بڑا دخل کبر سنی میں میری اپنی آوارگی کا بھی ہے۔ ادھر سے ادھر پھرتے رہنا میری مجبوری ہے۔ یہ چند سطور آپ کو مبارک باد دینے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ صفحہ ۴ ر اور ۵ ر پر قاضی مشتاق احمد صاحب کی تحریر 'اور بھی غم ہیں.....' حاصلِ رسالہ ہے۔ انھوں نے ایسے زخم کو کریدا ہے جسے مرہم کی نہیں جراحی کی ہی ضرورت ہے۔ ان تک سلام پہنچا دیجئے۔ سعید رحمانی صاحب کو بھی میرا اسلام پہنچا دیں۔ لکھنے کو بہت کچھ ہے نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔

☆ **مدہوش بلگرامی** (ہردوئی)

''ادبی محاذ'' کا تازہ شمارہ اپریل تا جون ۲۰۱۶ء نظر نواز ہوا۔ شکریہ۔ آپ کا اور تمام برادرانِ دسنوی کا بھر پور تعاون ''ادبی محاذ'' اور محترم سعید رحمانی صاحب کو آغاز سے ہی حاصل رہا ہے۔ آپ کے بڑے بھائی جناب شکیل دسنوی صاحب نے سعید رحمانی کے ہمراہ جو محنت و مشقت اور خون پسینہ ایک کر کے ''ادبی محاذ'' کو سجایا' سنوارا اور جو مقام و مقبولیت دلائی اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ آپ نے سعید رحمانی صاحب کی صحت اور ذمہ داریوں کا خیال کرتے ہوئے پرچہ کی ادارت کا ذمہ اپنے سر لے کر پرچہ کے ساتھ انصاف اور کرم فرما دوست و بزرگ جناب سعید رحمانی کی محبت و دستی اور جذبۂ اردو شعر و ادب کا حق ادا کیا ہے۔ جس کے سبب آب و تاب' معیار و مزاج اور خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ ادبی محاذ منظر عام پر آ تا رہا ہے۔ آپ کی ادارت میں اس میں مزید خوبصورتی اور شدت پیدا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محنت و لگن اور جذبۂ اردو زبان کو قائم و دائم رکھے۔

قاضی مشتاق احمد صاحب نے اپنی تحریر ''اور بھی غم ہیں زمانے میں اکاڈمی کے سوا'' میں آج کی سچائی اور حالات حاضرہ کا بھر پور جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی تحریر صرف پڑھنے کی نہیں سمجھنے اور عمل کرنے کی بھی دعوت دیتی ہے۔ ڈاکٹر حبیب راحت حباب کا گوشہ بہت جاندار ہے۔ اس وقیع اور معیاری گوشہ میں کئی اہم قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں۔ ان اہل قلم نے حبیب راحت حباب کی شخصیت اور تخلیقات پر اپنی وسیع النظری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے کئی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور وقار بخشا ہے جس کے سبب گوشہ حبیب راحت حباب قابل قدر ہو گیا ہے۔

نثر کے مقابلے غزلیات کا حصہ کافی بھاری ہے۔ مضامین تو عمدہ ہیں مگر غزلوں میں کس کس کا نام درج کروں سبھی اپنے معیار کے مطابق ٹھیک ہیں۔ بقول آپ کے اتنی تعداد کے شعراء کو ترتیب دینے میں حفظِ مراتب کا خیال رکھنا کارِ محال ہے۔ بھائی میرے! مراتب شکل و صورت' عمر اور روابط سے طے نہیں ہوتے۔ یہ نقطہ تخلیقات کے معیار اور پختگی سے نکل کر آتا ہے۔ جس کے یہاں تخلیقات کا معیار بلند ہے یہ میرا اپنا خیال ہے۔

☆ **منیر سیفی** (پٹنہ)

'ادبی محاذ) جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء ملا۔ میری تخلیق ص ۱۲ ر پر زبانِ کو زباں پڑھا جائے۔ یہ غلطی کمپوزنگ کی ہے۔ گوشۂ کبیر وارثی پسند آیا بطور خاص حضرت کا یہ شعر ؎

مزہ تو جب ہے محبت میں یہ اثر آئے۔ کہ دل ہمارا دُکھے آنکھ تیری بھر آئے

اختر کاظمی کا یہ مطلع ؎

شمس پر بادلوں کا ڈیرا ہے۔ ملگجی ملگجی سو یرا ہے

پڑھ کر علامہ وحشت کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

میں تو میں ہے سچ تو یہ ہے دشمن نہ بدلے اے فلک
ملگجا اس کا دوپٹہ چادر مہتاب سے

ڈاکٹر محمد زاہد کا یہ مصرع'

پرانی بات چھڑیں پھر وہی قصۂ جاں اپنا
قصۂ کو قصائے پڑھنے سے مصرع موزوں ہوگا

سید نفیس دسنوی کو غار حرا کے لیے اور عبدالمتین جامیؔ کو بساطِ سخن کے لیے بہار اردو اکاڈمی نے ۱۵'۱۵ ہزار روپے کا انعام دے کر اپنا قد بلند کیا ہے۔ میں دونوں حضرات کو دل کی گہرائی سے مبارک باد دیتا ہوں۔

مرحوم سید شکیل دسنوی کے سلسلے کا تاریخی قطعہ قبل ارسال کیا تھا' ترمیم شدہ قطعہ پھر ارسال کر رہا ہوں۔

☆ **حبیب راحت حباب** (کھنڈوہ' مدھیہ پردیش)

''ادبی محاذ'' روز افزوں خوب سے خوب تر کی منازل طے کرتا جا رہا ہے۔ آپ کے تجربات سے ادبی صحافت کی کمان سنبھالنے والی ٹیم ماشاءاللہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہی ہے۔ یہ اُردو زبان و ادب کے لئے فالِ نیک ہے۔ خاکسار کے گوشے پر اہلِ علم و دانش کے تأثرات میرے لئے سند کا حکم رکھتے ہیں۔ اس سے مجھے بھی اپنا احتساب کرنے کا موقع ملا۔ مشکور ہوں اردو ادب بالخصوص فنِ دوہا نگاری پر دستگاہ رکھنے والے معتبر ماہرینِ فن کا سپاس گزار ہوں ڈاکٹر اسلم حنیف، سلیم انصاری ڈاکٹر مقبول احمد مقبولؔ، عمر فاروق، جمیل

فاطمی، ڈاکٹر رضوان انصاری صاحبان کا۔ کتابت یا کمپوزنگ پر یقیناً آپ کی نظر تو رہتی ہی ہوگی لیکن کمپوزر حضرات پھر بھی لائقِ تحسین ہیں کہ آج کے اردو کش دور میں بھی وہ خسارے کا سودا کیے جا رہے ہیں، اور مقابلہ آرائی میں شامل ہو کر کسی نہ کسی طرح اردو والوں کی آبرو بچا رہے ہوئے ہیں۔ حالانکہ مذکورہ گوشے میں رسالے کے مشمولات کی فہرست مرتّب کرتے ہوئے آپ کے کاتب یا کمپوزر صاحب ''شتر بے مہار'' کے تخلیق کار ظہور شاہد کے ''شاہدؔ'' کی ''دال'' ہی کھا گئے ہیں۔ تاہم آپ کی محنتوں کو سلام کرتا ہوں۔ برادرم سلیم انصاری کی خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند دو ہے ارسالِ خدمت کر رہا ہوں، اگر ابھی شمارہ پریس میں نہیں گیا ہو تو بہتر ہوگا کہ اسی میں شامل اشاعت کر لیں، نوازش ہوگی۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں گے۔ غالباً ناطق صاحب فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے روانہ ہو چکے ہوں گے؟ اللہ ہر بندۂ مومن کو یہ سعادت بار بار نصیب کرے، اور شرفِ قبولیت بھی عطا کرے۔ آمین۔!

(نوٹ۔ ناطق صاحب فریضۂ حج کی سعادت حاصل کر کے واپس آ چکے ہیں)

☆**ایم۔اے احد** (بھوبنیشور، اڑیشا)

جون کے شمارے میں سرورق پر مدیر کی جگہ آپ کا نام نہ دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔ تشویش بھی ہوئی۔ اندر محاذ ثانی میں جناب نفیس صاحب کی وضاحت نے معاملہ صاف کر دیا۔ یقیناً آپ کو آرام کی ضرورت تھی۔ لیکن میری طرح آپ کے دیرینہ احباب کو ایک روحانی قلق اس لیے ہوتا ہے کہ آپ کے زیرِ سایہ پروان چڑھے ''ادبی محاذ'' کو ہم اپنا رسالہ سمجھتے تھے۔ آپ سے جو بے تکلفانہ اور مشفقانہ مراسم تھے اس میں کہیں کوئی رخنہ پیدا نہ ہو جائے اس کا اندیشہ ہے۔ آپ کا بے لوث خلوص، بے پناہ محبتیں، قدر شناسی، حوصلہ افزائی اور ہمہ وقت تعاون میرے لیے بیش قیمت اثاثہ ہے جس پر مجھے فخر و انبساط ہے۔ میں ہمیشہ آپ کا ممنون و مشکور رہوں گا۔

جولائی تا ستمبر کے شمارے میں اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اسے قابلِ اعتنا گردانا۔ اسی شمارے میں ڈاکٹر لطیف سبحانی کا مضمون ''جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کا اقلیتی کردار'' شامل ہے اور یہی مضمون اردو میلہ میں بھی شائع ہوا ہے۔ ایک ہی مضمون کو ایک سے زائد رسائل میں شائع کروانا میری دانست میں اشاعتی اصولوں کے منافی ہے۔

☆**یعقوب بدایونی:** (بجنور، یوپی)

ادبی محاذ کے اپریل تا جون کے شمارے میں گوشۂ ڈاکٹر حبیب راحت حبابؔ دیگر گوشۂ دانشوراں سے الگ نوعیت کا ہے۔ ان کی ایک چھوٹی سی کہانی ''ارتقائے آدم کا المیہ'' ہم کو مذہبی اور ادبی سوچ کی دعوت دیتی ہے۔ محمد غیاث الدین نے اپنے مطبوعہ ناول ''زوالِ آدمِ خاکی'' کے ذریعہ الگ نوعیت سے ہمیں سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ بقول اقبالؔ: ''یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے''۔ اصل میں پروردگارِ عالم نے ہر چیز کے ارتقائی منزل طے کرنے کے لیے یہ دنیا بنائی ہے۔ امام غزالیؒ نے اپنی تصنیف ''کیمیائے سعادت'' میں واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ غور طلب بات بھی ہے کہ ہم چار عناصر میں محدود ہیں لیکن ہندو مذہب میں ایک مزید عنصر ''آکاش'' بھی شامل ہے جو غور طلب ہے۔ مرنے کے بعد ارواح طبقاتِ علّیین اور سجّین میں چلی جاتی ہیں جو زماں و مکاں میں مقید ہوتے ہوئے بھی مقید نہیں ہوتیں اور باری تعالیٰ کے حکم سے چلتی پھرتی رہتی ہیں۔ احادیثِ شریفہ اس ضمن میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

بہر حال گوشۂ حبیب اچھا لگا۔ سارے مضامین خوب ہیں۔ میں بس اتنا ہی کہوں گا:

اس کہکشاں سے کس طرح باتیں کروں گا میں
آتا نہیں ہے مجھ کو ستاروں سے بولنا

☆**کبیر وارثی** (دیوہ شریف، یوپی)

جولائی تا ستمبر کے شمارے میں اپنا گوشہ شامل دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ اس کے لیے مجھے متعدد احباب نے مبارکباد دی اور گوشے کو سراہا۔ اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ بطورِ خاص میں ان قلمکاروں کا بھی رہینِ منت ہوں جن کی گرانقدر تحریروں سے یہ گوشہ منور ہے۔ ان میں جناب سعید رحمانی، جناب سمیع الحق شاکرؔ، جناب شارق عدیل، جناب رفیق شاہین اور جناب صابر ادیب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ناچیز کے کلام کا بغور مطالعہ کیا اور اس ناچیز کو ذرّے سے آفتاب بنا ڈالا۔

☆☆☆

جاوید ندیم
103,QasvaPlaza.PatelMohalla
Panvel.NaviMumbai-410306
Mob-9224424235

ایک غزل

ملنے کو مجھ سے وہ بھی بہت بے قرار تھا
میرا بھی دل پہ اپنے کہاں اختیار تھا
کس کے لیے تھی کل میری آنکھوں میں تشنگی
وہ کون تھا کہ جس کا مجھے انتظار تھا
کل بھی رہا ہے سب کو یونہی موت پر یقیں
کل بھی کہاں حیات ترا اعتبار تھا
ہوتے اگر نہ خواب تو جینا محال تھا
دشتِ حیات کیا تھا فقط خارزار تھا
یہ تو خدا کا فضل تھا محفوظ میں رہا
کرنے کو موسموں نے کیا مجھ پہ وار تھا
ہم کو کہاں تھا اس کو بلانے میں پیش و پس
اس کو ہی کچھ ندیمؔ جی آنے میں عار تھا

مــــنــــظــــومــــات

ناوک حمزہ پوری
DarulAdab.Hamzapur
P.O:Sherghati.Gaya-824211

گیارہ مطلعے

کیوں سرد ہوئی گرمیٔ بازار میاں جی؟ — کھوٹا تو نہیں سکّۂ کردار میاں جی؟
کیا کہتے ہیں ان ملبوں کے انبار میاں جی؟ — کیا ہوگیے شہر بھیج ۱ و انبار ۲ میاں جی؟
تم سوئے ہو اغیار میں بیدار میاں جی — ہوتا ہے بلاوجہ کوئی خوار میاں جی؟
سر ہی نہ سلامت ہے جب اے یار میاں جی — کس کام کے یہ جبّہ و دستار میاں جی؟
سید ہے یہٗ وہ شیخ، وہ انصار میاں جی — تفریق کی کب ڈھاؤگے دیوار میاں جی؟
کم عقل نہیں ہوتے ہیں سردار میاں جی — ہیں ایک ریاست کے وہ مختار میاں جی؟
اس طرح جو بیٹھے رہے بیکار میاں جی — لوگوں کی نظر میں نہ ہوں کیوں خوار میاں جی؟
پیچھے ہی چلے جاتے ہو گھر بار میاں جی — کیا تم بھی ہویے ملک کی سرکار میاں جی؟
ہوتے نہ درِ غیر پہ یوں خوار میاں جی — توحید کے ہوتے جو پرستار میاں جی؟
کس طرح ہویے آپ یہاں خوار میاں جی — اس ملک میں تھی آپ کی سرکار میاں جی؟
ناوک ہے یہ ذہنیتِ بیمار میاں جی — اس عمر میں ذکرِ لب و رخسار میاں جی؟

۱ اور ۲ دو معروف شہروں کے نام

مہدی پرتاپگڑھی
28.SchoolWard.Pratapgarh
U.P-230001

عید کے دن

کیف میں ڈوب گیا سارا جہاں عید کے دن — دیدنی ہوگیا ہستی کا سماں عید کے دن
بہرِ سجدہ جو چلے پیر و جواں عید کے دن — ہوا انساں پہ فرشتوں کا گماں عید کے دن
ہوئی گل بیز فضا، جھوم اٹھے اہلِ چمن — قافلہ پھولوں کا ہو جیسے رواں عید کے دن
اس طرح ڈوب گیا لمحوں کی سرشاری میں — ہوگیا دور ہر اک دردِ نہاں عید کے دن
غیر نے عید مبارک جو کہا مل کے گلے — میری آنکھوں سے ہویے اشک رواں عید کے دن
جس قدر پیار کی دولت ملی بیگانوں سے — ایسا ایثار تھا اپنوں میں کہاں عید کے دن
اس قدر عام ہوئی رحمتِ باری تعالیٰ — تنگ دامانی پہ تھا مجھ کو گماں عید کے دن
نہ گراں باری کا احساس نہ فکرِ غمِ دل — نہ رہا وسوسۂ سود و زیاں عید کے دن
دشمنی چھوڑو گلے مل کے گِلے دور کرو — رب کے الطاف کا دریا ہے رواں عید کے دن

حمدِ باری میں کبھی، نعتِ نبی میں مہدؔی
ہم دکھاتے ہی رہے زورِ بیاں عید کے دن

احمد رشید (علیگ)
GaliRahat Wala Kuan
SaraiRahman.Aligarh-202001

دعا

حدودِ ارض وسما سے نکل کر
جائیں تو کدھر
تیری ہی مدد اور توفیق چاہتا ہوں
ایک ایسے سجدے کے لیے جو معتبر ہو
سببِ شرفِ قبولیت ہو
بھٹکے ہوئے کے ساتھ صراطِ مستقیم پر
مجھے بھی ڈال دے
منزل کے لیے منارۂ روشنی بن جا
تھکے ماندے مسافروں کو آبِ زمزم پلا
آبِ کوثر اور شہد وشیر کا جام دے
بھول بھلیوں کے اندھیرے کو کاٹ دے
وہ بارِ ذہیں چاہیے
جو نارِ غضب برسایے
مجھے تیری اماں چاہیے
بس تیرا پیار چاہیے

ظہیر احمد ظہیر
H.No:19-4-16/91,FarooqNagar
FalakNuma.NearPatelHotel
Hyderabad-500055

دوقطعات

ظلم جب بڑھے گا تو کرسیاں بدل دیں گے
کھل اٹھیں گے چہرے سب سسکیاں بدل دیں گے
سہہ لیے ظہیؔر ہم نے ظلم آج تک لیکن
تخت وتاج کیا شے ہے گدیاں بدل دیں گے

☆

منہ غریبوں سے موڑ لیتی ہے
دل امیروں سے جوڑ لیتی ہے
بے وفا ہے ظہیؔر یہ دنیا
خوں بدن سے نچوڑ لیتی ہے

☆☆☆

ناز پرتاپگڑھی
193/23,WaliNagar.Lucknow
Road.Wahimgar-229001(U.P)

محترم عبدالمتین جامیؔ کے مجموعۂ رباعیات "مونسِ سخن" پر تاثرات

دیکھا ہے "مونسِ سخن" جامیؔ کا
خوشبو سے ہے بھرپور چمن جامیؔ کا
جامیؔ ہیں اڑیشا میں دکن کے امجد
مشہور نہ ہو کیسے وطن جامیؔ کا

☆

مفہوم و مطالب کا ہنر رکھتی ہے
سطحِ دلِ حساس کو تر رکھتی ہے
جامیؔ کی آزاد رباعی گوئی
پابند رباعی کا اثر رکھتی ہے

☆

کیا راہ نکالی ہے جامیؔ تو نے
افکار میں حد کی ہے جامیؔ تو نے
سانیٹ، ترائلے رباعی میں کہے
تاریخ نئی لکھی ہے جامیؔ تو نے

منیر سیفی (پٹنہ)
Mob-9835268274

عطا عابدی کی تخلیق "دریچے" سے کی تاریخِ طبع

فصاحت اور بلاغت کھلی دریچے سے
ہیں شاہ کلک عطاؔ عابدی دریچے سے
منیرؔ مختلف اصناف کا یہ مجموعہ
ہے اسم جس کا بہت واجبی دریچے سے
صنائع اور بدائع کا لطف کیا کہنا
ہر ایک لفظ میں ہے چاشنی دریچے سے
ہے خوشبوؤں سے معطر ہر اک دماغ و دل
رواں ہے شعر و ادب کی ندی دریچے سے
عطا نے یوں تو کتابیں لکھی ہیں درجن بھر
ملی سبھی کو نئی زندگی دریچے سے
ضرور چشمۂ سیماب کا کرشمہ ہے
شبِ سیاہ جو روشن ہوئی دریچے سے
مجھے "تھی فکر جو تاریخِ طبع" "منظومات"
1437 2016
سنین مل گیے خود اوپری دریچے سے

علیم صبا نویدی
Mob-9840361399

تاجدار جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن کی وفات پر ایک سانیٹ

جمالیاتِ ادب کا وہ نور جاتا رہا
جہانِ شعر و ادب پہ تھی جس کی گہری نظر
بڑا حسین رہا جس کی جستجو کا سفر
وہ پاسدارِ جمالِ شعور جاتا رہا

وہ خامہ زیبِ ورق کا حسیں مقدر تھا زمیں پہ
رہ کے زمیں کو فلک بناتا تھا
جمالِ فکر کی جہتیں نئی سجاتا تھا
وہ اپنی ایک الگ سوچ سے منور تھا

خدا نے اس کو شعوری جمال بخشا تھا
نظر میں اس کے تھے پیغمبری نقوش بہت
دل و دماغ میں تھے انوری نقوش بہت
اسے حبیبِ خدا نے کمال بخشا تھا

جمالیات کا صاحب نظر ہوا رخصت
دیارِ فن کا وہ لعل و گوہر ہوا رخصت

ڈھائی اکھشر کیا پڑھیں، اب تو ہے یہ حال
ریشم جیسی دیہہ بھی، پل پل ہووے ٹاٹ
ریشم جیسی دیہہ کو، دیمک کرتی خاک
شام، یمن اُر قاہرہ، بصرہ اور دمشق
یہ قسمت کے کھیل ہیں، چادر سے کیا بیر
اندھیارا انیائے کا، دور کریں شریمان
جگنو مٹھی میں لیے، کریں روشنی قید
اپنا لہو سفید بھی، اِن کو نظر نہ آیے
چُھوا چُھوت میں بٹ گئی، ہندُستانی قوم

گھوڑے جیسا چل رہے، ڈھائی گھر کی چال
جوگی تُم تو جا بسے، گنگا جی کے گھاٹ
'سدّھی ودّھی' جوگیا، لگتی "پھکیم پھاک"
بھٹکے ہے لے کر مجھے، در در تیرا عشق
سر ڈھکنے کے پھیر میں، کُھل جاتے ہیں پیر
آ ؤ کر دیں نیائے کو، اپنی آنکھیں دان
کلمونہوں کے ہاتھ میں سب کا سیہَ سفید
کلمونہوں کی آنکھ میں، کا جل کون لگا یے
بپتسمہ لینے لگے، دُکھیا، شبری، ڈوم

گوشۂ سید شکیل دسنوی (مرحوم)

سوانحی اشارے

اصل نام :سید شکیل منظر حسن

قلمی نام :سید شکیل دسنوی

تاریخِ ولادت :۲۰ رفروری ۱۹۴۱ء

مقامِ پیدائش :بہار شریف (بہار)

وفات :۴ راپریل ۲۰۱۴ء

ولدیت :پروفیسر سید منظر حسن دسنوی (مرحوم)

:محترمہ نورالصباح مرحومہ

تعلیم :بی۔ایس سی (کیمسٹری) انجینئرنگ ایم۔ای (پی۔ایچ)

ملازمت :سپرنٹنڈنگ انجینئر موظف (۱۹۹۹) ۔حکومتِ اڈیشا

مطبوعات :زندگی اے زندگی (۱۹۸۱ء)، تنہا تنہا (اردو ۱۹۸۹ تنہا تنہا (ہندی ایڈیشن ۱۹۹۱ء)، کتنی حقیقت کتنا خواب (۲۰۰۵ء)، دلِ نا آشنا (۲۰۰۶ء)، طفلی ترانے (طفلی منظومات۔۲۰۱۰ء۔دو ایڈیشن)، باز دید (مضامین ۲۰۱۱ء)، اندازِ بیاں (مضامین ۲۰۱۱ء)، سانجھ بھئی چودیس (خسرو رنگ دوہے ۲۰۱۲ء)، یادوں کی دہلیز (مرتبہ ۲۰۰۵)) وجدان (مرتبہ ۲۰۱۲ء)

اعزازات :مطبوعہ کتابوں کو یوپی اردو اکاڈمی (۱۹۸۱ء)، بہار اردو اکاڈمی ۱۹۸۳ء) اور اڑیشا اردو اکاڈمی (۱۹۹۴ء) نے ایوارڈ سے نوازا گیا۔اس کے علاوہ غالب ایوارڈ (بنگلور۔۱۹۹۱)، سوا گتیکا ایوارڈ (کٹک ۱۹۹۳ء) اور نجمی اکاڈمی ایوارڈ۔کٹک۔۲۰۱۲ء) کی جانب سے ادبی خدمات کے اعتراف میں سپاس نامے اور میمنٹو پیش کیے گئے)

اداروں سے وابستگی: سرپرست ادبی محاذ۔کٹک، سرپرست فیضانِ ادب۔کٹک

پسندیدہ اصناف :شاعری بطورِ خاص صنفِ غزل

دیگر اصنافِ سخن :تبصرہ نگاری، نقد و تحقیق اور ادبی محاذ کے لیے اداریے بعنوان ''محاذِ اول''

اولاد :انجینئر سید آصف حسن اور انجینئر سید راشد حسن

تعارف

ادبی منظر نامہ میں سید شکیل دسنوی (مرحوم) نے اپنی تخلیقی شادابیوں کے جو دلکش نقوش مرتب کیے ہیں وہ بہر طور انمٹ رہیں گے۔شاعری کے علاوہ نقد و ادب کے باب میں انھوں نے گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ادبِ اطفال پر توجہ دی تو اسے بھی بامِ عروج تک پہنچایا۔بچوں کے لیے ان کے مجموعے ''طفلی ترانے'' کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک قلیل مدت کے اندر اس کے دو ایڈیشن شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔شعری مجموعوں میں زندگی اے زندگی، تنہا تنہا، کتنی حقیقت کتنا خواب، اور دلِ نا آشنا کی کافی پذیرائی کی گئی۔مضامین کے مجموعوں میں باز دید اور اندازِ بیاں ان کی تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کے عمدہ نمونے ہیں۔اس کے علاوہ دوہوں کا مجموعہ ''سانجھ بھئی چودیس'' میں ان کے خسرو رنگ دوہے شامل ہیں۔یادوں کی دہلیز اور وجدان اُن کے مرتبہ شعری مجموعے ہیں جن میں بالترتیب اپنے والد ماجد اور خسر صاحبان کے کلام کو پس از مرگ شائع کروایا ہے۔

مذکورہ کتابوں کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ شاعری میں جہاں انھوں نے اپنی انفرادی شان پیدا کی ہے وہیں تنقید و تحقیق کے باب میں اپنی تنقیدی بصیرت، صلابتِ فکری اور ژرف نگاہی کا بین ثبوت پیش کیا ہے۔مختصراً یہ کہنا چاہوں گا کہ آسمانِ ادب پر ایسی محترم ہستیاں خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں۔اقبال ایسے ہی فنکار کے لیے کہہ گئے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ادبی محاذ کے سرپرست کی حیثیت سے بھی انھوں نے دامے درمے سخنے ہر طرح سے اپنا تعاون پیش کیا۔آج ادبی محاذ جس بلندی پر ہے اور اسے جو مقبولیت حاصل ہے یہ انھیں کی رہینِ منت ہے۔

مرحوم پر یہ گوشہ بطور خراجِ عقیدت پیش کیا جا رہا ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ یہ پھر بھی تشنہ ہے کیونکہ اس میں مرحوم کے بہت سارے روشن پہلو تشنہ رہ گئے ہیں اور یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔نفیس صاحب کا ارادہ ہے کہ موقع ملتے ہی پورا رسالہ انھیں کے نام سے شائع کیا جائے۔پھر بھی یہ گوشہ آپ کو کیسا لگا یہ جاننے کے لیے ہمیں آپ کی گرانقدر آرا کا انتظار رہے گا۔

.................................سعید رحمانی

قاضی رؤف انجم
Qazipura.Barsitakli
Dist:Akola-444401(M.S)

سید شکیل دسنوی...ایک نا قابلِ فراموش قلمکار
(دلِ نا آشنا کے حوالے سے)

سید شکیل دسنوی (مرحوم) ۲۰ر فروری ۱۹۴۱ء کو دسنہ بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار سید منظر حسن دسنوی اپنے وقت کے ایک قادر الکلام اور پختہ گو شاعر تھے۔ اس لحاظ سے فن شاعری سید شکیل دسنوی کو ورثے میں ملی ہوئی سوغات ہے۔ اسی لئے ان کے اشعار میں یک گونہ پختگی، معنوی گہرائی اور دلپذیری پائی جاتی ہے۔ ان کے دو مجموعے اردو میں اور دو مجموعے دیوناگری زبان میں شائع ہو کر مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اردو زبان میں اُن کا تیسرا مجموعہ 'دلِ نا آشنا' ہے جو ان کی پہلی دو تخلیقات ''زندگی اے زندگی'' اور ''تنہا تنہا'' کے انتخاب پر مبنی ہے اور جو اس وقت میرے سامنے ہے۔

کٹک اڑیسہ سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ''ادبی محاذ'' کے مدیر باتدبیر عالی جناب سعید رحمانی کا حکم ہے کہ میں سید شکیل دسنوی (مرحوم) کے اس عنوان پر ایک مضمون لکھوں سو اس حکم کی بجا آوری کے لئے قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھا ہوں۔ دعا فرمایئے کہ بھائی سعید رحمانی کے اعتماد پر کھرا اتر سکوں۔

اردو ادب کی تحریری و تقریری زبان بندی میں شمالی ہند کے نمایاں شہروں، قصبوں، گاؤں اور بستیوں کی خدمات نا قابل فراموش تو ہیں ہی لیکن بہار اور مہاراشٹر سے بھی اردو ادب کی آبیاری ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں سندیلہ اور دسنہ کے نام مشہور ہیں۔ یہ علم نواز بستیاں علم و ادب، تاریخ و ثقافت کے مراکز رہی ہیں۔ دسنہ بہار کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن علمی، ادبی اور ثقافتی لحاظ سے مردم خیز بستی ہے جہاں سے بڑے ذی علم اور صاحب کمال لوگ پیدا ہوئے، جن میں سب سے زیادہ معزز ذی وقار اور محترم نام حضرت سید سلیمان ندوی کا ہے جن کے نام نامی اور اسم گرامی سے ہر اہل نظر واقف ہے۔ ان کے علاوہ علم و ادب سے زرخیز اس سر زمین سے مولانا ابوظفر احسان ندوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، سید شہاب الدین دسنوی اور ڈاکٹر عبدالقوی کے نام نامی گنوائے جا سکتے ہیں۔ انہیں ناموں میں ایک نام سید شکیل دسنوی کا بھی آتا ہے جو پیشے کے لحاظ سے تو مشینی کل پرزوں کے ماہر انجینئر ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ بی ایس سی آنرز، بی ایس سی انجینئر ایم ای پی ایچ ہیں۔ پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ اڑیسہ سے ۱۹۹۹ء میں وظیفہ یاب ہو کر بیڑا ناسی کٹک میں قیام پذیر تھے۔ اچھا شعری ذوق رکھتے تھے۔ ان کے والد بزرگوار سید منظر حسن دسنوی (مرحوم) اپنی ملازمت کے سلسلے میں دسنہ سے کٹک (اڑیسہ) آئے تو ان کے ہمراہ شکیل دسنوی بھی آ گئے۔ اسی لئے میں کہہ چکا ہوں کہ شعری ذوق شکیل دسنوی کو ورثے میں ملا ہے۔ اور انھوں نے اردو زبان وادب کی صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی اور خوب داد و تحسین سے نوازے گئے۔ سید شکیل دسنوی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے نظم، گیت اور دوہے بھی لکھے ہیں۔ بچوں کے لئے بھی شاعری کی۔ پھر بھی اصلاً وہ غزل ہی کے شاعر ہیں اور غزل ہی میں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔ اردو شاعری کی قدیم اصناف مرثیہ، قصیدہ، مثنوی وغیرہ کے بارے میں کچھ کہا جائے تو یہ اصناف اب داستانِ پارینہ ہو چکی ہیں اور شاذ و نادر ہی کہیں درسی کتابوں میں نظر آ جاتی ہیں۔

لیکن پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ غزل ہماری ہندوستانی تہذیب ہے اور ہماری تہذیب غزل میں ڈھلی ہوئی ہے۔ کچھ صاحبانِ نظر و بحر نے غزل میں ترسیل کی کمی کا اظہار فرمایا ہے جن میں الطاف حسین حالی اور کلیم الدین احمد کے خیالات سرفہرست ہیں، پھر بھی بقول آل احمد سرور کہا جا سکتا ہے کہ غزل ہمارے اردو ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمھاری بات بھی ہے

اردو زبان میں صنفِ غزل فارسی کے راستے اور اس کی روایات سے داخل ہوئی جس نے ان روایات میں کچھ اضافے بھی کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل بحیثیت صنفِ سخن حسین تر، متاثر کن اور اثر انگیز بھی ہے۔ ''شاعری جزو یست از پیغمبری'' اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ جو ہر ہر ایک کو نہیں ملتا، یہ عطیۂ خداوندی ہے۔ ''ایں سعادت بزور بازو نیست، گر نہ بخشد خدائے بخشندہ''۔ دسنہ کے علمی ادبی ماحول، خاندان کا علمی ادبی رہن سہن، معاشرے میں لوگوں کا انداز گفتگو اور علمی ادبی ماحول نے سید شکیل دسنوی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہن کی توجہ شعر گوئی کی طرف مبذول کرائی۔ غزل کے تعلق سے اپنی

(بقیہ صفحہ 23 پر)

ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی
زبیدہ ڈگری کالج۔ جے نگر، شکاری پور، شیموگہ کرناٹک
Mob:9945462187

خسرو رنگ۔ سید شکیل دسنوی

سید شکیل دسنوی ایک ہمہ جہت اور تجربہ پسند شاعر اور ادیب ہیں۔ انھیں نظم ونثر دونوں سے شغف ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ وہ اردو زبان وادب کی صحت مند روایت کے مطابق بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھتے ہیں اور کہنا چاہیے کہ خوب لکھتے ہیں۔ ان کی بچوں کے لیے لکھی نظموں کی ایک کتاب ''طفلی ترانے'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ سید شکیل دسنوی ان دنوں مضامین بھی خوب لکھ رہے ہیں۔ گویا وہ ہر سطح پر اپنی ادب شناسی اور ادب جوئی کا احساس پیدا کرنے کی سعی میں مصروف ومنہمک ہیں۔ ان کی تخلیقیت خیزی میں ایک طرح کی تازہ کاری کا احساس پایا جاتا ہے۔ یعنی ان کے یہاں ٹھہراؤ یا طبعی عمر کی کہولت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ جب کہ روایت کی قبولیت اور فن پر دسترس ہونے کی سہولت ہونے کا احساس زندہ ہے۔ اس وقت ان کی خسرو رنگ شاعری کا مجموعہ ''سانجھ بھئی چودیش'' میرے پیش نظر ہے۔ میں نے سید شکیل دسنوی کی شاعری کو خسرو رنگ اس لیے کہا ہے کہ ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے ان کی شاعری کو اسی نام سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

حضرت امیر خسرو کا شمار یگانہ روزگار شخصیتوں میں ہوتا ہے جو صدیوں میں اس دھرتی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ شاعری ہو یا سیاست موسیقی ہو یا تصوف ہر میدان میں امیر خسرو اس معراج کمال کو پہنچ چکے تھے جسے عبور کرنے کی کوشش میں دیگر دانشوران مشرق ومغرب کی بلند پروازی تخیل کے بال و پر جل جایا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر کرامت صاحب نے اسے ''معراج کمال'' کہہ کر معراج اور کمال دونوں کی تخصیص کردی ورنہ ہمیں بلند پروازی تخیل کے بال و پر جل جانے پر بڑی الجھن ہوتی۔ بہر حال وہ آگے مزید لکھتے ہیں کہ:

موصوف نے جہاں صنعتِ ذوالسانین میں اردو فارسی کو ہم آمیز کر کے اردو میں صنف غزل کی اختراع کی وہیں پراکرت سے دوہے کی صنف میں طبع آزمائی کر کے امکانات کو روشن کیا۔ انھوں نے جب اپنے پیرومرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی رحلت کی خبر سنی تو ان کی زبان سے بے ساختہ ریختی کا یہ شعر نکل گیا۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
خسرو چل گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

سید شکیل دسنوی امیر خسرو کی شاعری سے شروع ہی سے متاثر ہیں۔ انھوں نے ان کے لب و لہجے میں کہے گئے شعری مجموعہ کا نام ''سانجھ بھئی چودیس'' خسرو کے مذکورہ شعر سے اخذ کیا ہے جو خسرو کے حوالے سے ان کی عقیدت کا اشاریہ ہے۔

ڈاکٹر کرامت علی کرامت بزرگ شاعر اور ناقد ہیں۔ ان کا علمی مرتبہ بھی قابل لحاظ ہے۔ اس لئے جب وہ شکیل دسنوی کی شاعری کو خسرو رنگ شاعری قرار دیتے ہیں تو گویا شاعر کی محنت اور ریاضت دونوں کی سند مل جاتی ہے۔ اور پڑھنے والے پر بھی بڑا عمدہ اثر پڑتا ہے، اور کئی لوگ تو محض خسرو زبان کی لذت کے شوق میں سید صاحب کی شاعری پڑھ جاتے ہیں۔

ساٹھ، ستر صفحے کی اس کتاب میں سید شکیل دسنوی نے بہت کچھ سمو دیا ہے۔ اس کتاب کے صفحات پر شاعری کے اتنے روپ بکھرے پڑے ہیں کہ قاری شوق دیدار اور ذوق تجدید ذائقہ کی جستجو میں بغیر کسی الجھن یا بوریت کے پوری کتاب پڑھ جاتا ہے۔ اس کتاب میں دوہوں کے علاوہ دوہا غزلیں، غزل دوہے دوہا گیت، دوہا نظم، (نظم دوہے نہیں) برہا گیت، گیت برہن، گیت غزل (غزل گیت نہیں) ماہیے، مکرانیاں کے علاوہ سید جی کے ستّر منتخب متفرق خسرو رنگ اشعار بھی شامل ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے۔

ہم نے کاٹا عمر کا کیسا یہ بن باس ۔ یہ رمائن کون لکھے کہاں ہیں تلسی داس
من منزل کی کھوج میں رستہ ڈھونڈے پاؤں۔ چلتے چلتے عمر کٹی ملا نہ تیرا گاؤں
دل کی جھولی کھو لیے کچھ تو کیجیے دان۔ پیار بھرے دو بول ہوں یا میٹھی مسکان
تلوے نیچے دم کٹے اور آنکھوں میں رات۔ سید جی مت پوچھیے کیسے ہیں حالات

سید جی کے دوہے میں زندگی کے کئی روپ انوپ کے جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ ان کے دوہے مشاہدے کی آنکھ سے ٹپکے اور تجربے کی کوکھ سے جنمے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے دوہا غزل اور غزل دوہے سے بھی ایک آدھ مثالیں دیکھیے۔

کتنے یگ کا سوچ مت ہوا تجھے بن باس۔ مرضی ہنس کر کاٹ لے یا پھر رو رو کاٹ
مٹی اب بتیائے چھوڑ بھی جگ کا موہ۔ اب تو آجا کوکھ میں عمر ہوئی ہے ساٹھ
جوڑ کے رشتہ آنکھوں سے وہ یوں گھبرائی آج۔ عارض دہکے موتی چمکے خود سے آئی لاج

سید شکیل دسنوی کی شاعری میں جو سوندھا پن اور مٹی و ماحول کا جو اپنا پن پایا جاتا ہے وہ قاری کو پوری طرح اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے۔ سچ ہی کہا جاتا ہے کہ آج تک

تم کیسے ستم گر ہو تہذیبِ ستم سیکھو   کیوں دیکھ کے چپ سے ہو، کیوں آنکھ یہ بھر آئی

وہی شعرا مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو کبیر و خسروؔ اور ولیؔ کی زبان کی چاشنی اور پرتاثیر سادگی کے رمز کو سمجھ کر اپنانے کی صلاحیت پیدا کر سکے ہیں۔ سید شکیل دسنوی کے یہاں بھی اس آمیزے کا احساس پایا جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

بڑھے جو حد سے ظلم کبھی تیور بدلے کال
دھرتی کانپے پاپ سے آجائے بھونچال
آجائے بھونچال رے بابا
آجائے بھونچال........

(دوہا گیت)

جوبن پر ہیں جھیل ندی سب
ناچیں گائیں سنگ سکھی سب
مست ہوئے ہیں سنت کوی سب
چین نہ پاؤں جی گھبرائے
نیل گگن میں بادل چھائے
نیل گگن میں ہو
من تڑپے من میت نہ آئے
سمئے کا بندھن توڑ نہ پائے
کون مجھے اب رنگ لگائے
لمس کس کا جی ترسائے ہے
نیل گگن میں بادل چھائے
نیل گگن میں ہو امنڈ امنڈ کے بادل آئے
امنڈ امنڈ کے ہو

گیت غزل:

تم جو ہوتے کرشن کنھیا، روپ کی کرتی چوری رے
مالا جپ جپ رات گنوائی پاس کھڑی تھی گوری رے
اک نٹ کھٹ سا سانولا لڑکا پیچھے پڑا ہے جانے کیوں
جب بھی دیکھے کہیں اکیلی، باہیہ پکڑ لے موری رے
ایک پتنگ سی ہوا میں ڈولوں نیل گگن کو اڑ کے چھولوں
باندھ دے اک دن کسی سے مجھکو پریم کی کچی ڈوری رے

ان اشعار اور نظم کے ٹکڑوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ سید شکیل دسنوی کی شاعری میں چنری کے کچے رنگ کا داغ کس طرح جوت جگاتا ہے۔ اور زندگی کی پکی سڑک کی بجائے کچے راستے کی دھول اور مٹی کی باس کو کس طرح سینت سینت کر رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان کی خسرو رنگ غزل بھی دیکھئے کہ اس کا اپنا ہی ذائقہ ہے۔

ہیں کتنی قاتل کسے خبر ہے حیا میں ڈوبی کنواری انکھیاں
کٹے ہیں سید تڑپ تڑپ کر ہجر میں اب تو ہماری رتیاں
یہ قیس ولیلیٰ یہ ہیر رانجھا تھے روپ کس کے سروپ کس کے
بسی ہیں صدیوں کی دھڑکنوں میں ہماری بتیاں تمھاری بتیاں
چھلک اٹھے ہیں نین سکھی رے چین ہے نہ قرار دل کو
برہ میں آئیں جو یاد ان کی وہ میٹھی میٹھی سی پیاری بتیاں
چھپاؤ جتنا بھی بھید کھولے جھکی جھکی سی نظریں تمھاری
کسی کا چپکے سے نام لے کر جو چھیڑتی ہیں تمھاری سکھیاں
کسی بھی پہلو نہ چین آئے، کہیں نہ دل کو قرار آئے
عجب ہے قصہ ملے ہیں جب سے ہماری انکھیاں تمھاری انکھیاں
یہ شام اپنی نہ یہ سویرا یہ اجنبی سا شہر عجب ہے
بھٹک رہے ہیں قدم قدم پر بلا رہی ہیں تمھاری گلیاں

قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ سید شکیل دسنوی نے بعض دوسرے دوہا نگار شعرا کی طرح بھاری بھرکم ہندی الفاظ سے گریز کیا ہے۔ اور اپنی زبان کو حتی المقدور سہل اور کھڑی بولی کے قریب اور سجل رکھا ہے۔ کتاب کے اخیر میں سید شکیل دسنوی امیر خسرو کے رنگ میں کہے اپنے جو ستر اشعار شامل کیے ہیں وہ بھی دلچسپ ہیں۔ چند اشعار دیکھیے۔

کیا جانوں کیوں نگری نگری ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
دکھ کے کالے سائے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں
کتنی امیدیں کتنی سپنے پیاسے پیاسے پھرتے ہیں
جھانک کے دیکھے کاش کوئی ان آنکھوں کی گہرائی میں
پاؤں میں چھالے پڑنے لگے ہیں راہ وفا میں چلتے چلتے
ڈوب نہ جائے آس کا سورج دھیرے دھیرے ڈھلتے ڈھلتے
اب بھی گھر دالانوں میں یادیں چلتی پھرتی ہوں گی
کوئی کنواری آنکھوں میں کچھ خواب سہانے بنتا ہوگا

مجموعی طور یہ کہا جاسکتا ہے کہ سید شکیل دسنوی کی کتاب ''سانجھ بھئی چودیس'' بھلے سے ضخامت کے اعتبار سے مختصر ہے مگر اپنے موضوع اور مواد اور زبان کے برتنے کے سلیقے اور عوامی مزاج کی خوشبو کی وجہ سے دلچسپ ہے۔

☆☆☆

منیر سیفی
رابطہ:۔09835268274

سید شکیل دسنوی کا شعری آفاق

کہنے کو تو دسنہ، بہار شریف، ضلع نالندہ (بہار) کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ لیکن اس مردم خیز قصبے کی مٹی نے بڑی بڑی ذی علم ہستیوں کو جنم دیا ہے۔ حضرت سید سلیمان ندوی کے نام نامی اسم گرامی سے کون ہے جو واقف نہیں ہوگا۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

پروفیسر عبدالقوی دسنوی (متوفی 7 جولائی 2011) مولانا ابوظفر ندوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، سید صباح الدین، عبدالرحمٰن اور سید شہاب الدین دسنوی جیسے صاحب علم حضرات دسنہ میں پیدا ہوئے۔ کہہ سکتے ہیں کہ

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

سید شکیل دسنوی (20.2.1941-4.4.2014) کے والد ماجد سید منظر حسن دسنوی، جو خود بھی شاعر تھے، کٹک میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ سید شکیل دسنوی کو شعری ذوق ورثے میں ملا۔ شکیل دسنوی کے خسر محترم سید اصغر حسین مجیبی (1912-1986) مدفون چھوٹی درگاہ، بہار شریف، کا ایک مختصر سا شعری مجموعہ ''وجدان'' کے نام سے سید شکیل دسنوی نے 2012 میں اپنے 'پیش لفظ' کے ساتھ شائع کیا تھا۔ بطور تبرک ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

خود کی بخیہ گری سے جو ہو سکا نہ رفو۔ وہ کام آپ کے انداز گفتگو نے کیا

سید شکیل دسنوی کے برادر عزیز سید نفیس دسنوی کے دو شعری مجموعے ''حرف جادواں'' (جون 2011) اور ''نور حرا'' (جولائی 2014) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سید شکیل کے فرزند ارجمند سید آصف دسنوی کا بھی ایک شعری مجموعہ (2013) منظر عام پر آ چکا ہے۔

سید شکیل دسنوی اہل نظر استاد شاعر و ادیب تھے۔ موصوف نے دو نسلوں کی آبیاری کی ہے۔ مرحوم کے رشحات قلم تواتر سے موقر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ان کا اصل میدان غزل ہی تھا۔ ولی دکنی سے شکیل دسنوی تک زندگی مسلسل کروٹیں لیتی ہے اور اس کا منفی و مثبت اثر اہل قلم پر بھی پڑا جو فطری تھا۔

سید شکیل دسنوی کے تین شعری مجموعوں زندگی اے زندگی (دسمبر 1981) تنہا تنہا (جون 1989) کتنی حقیقت خواب (2005) میں، مشمولہ کلام کا انتخاب دلِ نا آشنا (2006) ہے۔ اِن کتابوں کے علاوہ موصوف کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو کر مقبول چکی ہیں:۔

ا۔ سانجھ بھئی چودیس (شعری مجموعہ)   ۲۔ طفلی ترانے (۲۰۱۲) بچوں کے لیے
۳۔ باز دید (۲۰۰۸) تبصراتی مضامین   ۴۔ اندازِ بیاں (۲۰۱۳) مضامین

گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف میں یو پی، بہار اور اڑیسہ اردو اکادمیاں ان کو ایوارڈز سے نواز چکی ہیں۔ شکیل دسنوی نے طفلی ترانے کے نام سے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں انھیں ادب اطفال کے لیے ایک گرانقدر اضافہ تصور کیا جاتا ہے اور ۱۳-۲۰۱۲ کے دوران اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ شکیل دسنوی کی شاعری کے حوالے سے جن جید شعرا، ادبا اور دانشوروں نے اپنی گراں آرا کا اظہار کیا ہے ان کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

مجروح سلطانپوری، علی احمد جلیلی، گلزار، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر شکیل الرحمٰن، نشتر خانقاہی، عبدالاحد ساز، ناوک حمزہ پوری اور دیگر۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی:

''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ غزل اردو شاعری کا تاج محل ہے۔'' ''ہماری تہذیب غزل میں ہے اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہے''

''دلِ نا آشنا'' کا مطالعہ کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی سے اتفاق ناگزیر ہو جاتا ہے۔

دن بھر جو ساتھ ساتھ تھی دفتر کی میز پر۔ بالیں پہ رات کو وہی فکر معاش ہے
کبھی مرکز تھا میں بھی روشنی کا۔ اندھیروں میں بکھر کر رہ گیا ہوں

معلوم ہوا کہ شاعر غم جاناں سے غم دوراں تک کے سفر کے دوران سنگلاخ و خاردار راستوں سے پابرہنہ گزرا ہے۔ شاعر کے ہاں جہاں غم جاناں کی میٹھی آنچ ہے وہیں غم دوراں کی تیز آنچ بھی محسوس کی جا سکتی ہے، اور یہ آنچ دفتر کی میز سے بالیں تک یعنی 24 گھنٹے شاعر کو کچھ کے لگاتی رہتی ہے۔

ملا جو شہر الم میں وہ اجنبی نہ رہا
ہر اک سے درد کا رشتہ بہت قریب سا تھا

آلام و مصائب سے دوچار اور آفات گزیدہ اس طرح ایک دوسرے

(بقیہ صفحہ 17 پر)

شارق عدیل
مقام وڈاکخانہ مارہرہ۔ضلع ایٹہ۔(یو۔پی)

بچوں کے شاعر۔شکیل دسنوی
(طفلی ترانے کے حوالے سے)

سید شکیل دسنوی، بہت ہی نیک دل اور تخلیقیت سے بھرپور شاعر وادیب تھے۔ان کی تنقیدی اور تبصراتی تحریریں فکر و خیال کی تازگی کا احساس دلایا کرتی تھیں،اوران کی غزلیہ شاعری کا تو ایک زمانہ معترف ہے۔اور یہی سبب ہے جوان کی نظم ونثر کے حوالے سے کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں،اور شعروادب کے باوقار کوچوں میں اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کر چکی ہیں۔انھوں نے عمر کے آخری پڑاؤ پر طفلی ادب کی تخلیق پر توجہ کی اور پوری طرح اپنی شعری قدآوری کا احساس دلاتے ہوئے طفلی شاعری کے امام اسماعیل میرٹھی کی یادوں کو تازہ کردیا۔''طفلی ترانے'' نام کی یہ پتلی سی کتاب بچوں کے لئے کسی نایاب تحفے سے کم نہیں ہے۔

مذکورہ کتاب کا پیش لفظ اپنے عہد کے قابل ذکر شاعر وادیب سعید رحمانی نے قلم بند کیا ہے۔اور انتساب ''سیدہ فاطمہ ارمان'' کے نام کیا گیا ہے۔جسے شکیل دسنوی کی پوتی ہونے کا فخر حاصل ہے۔جب انسان بزرگی کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے تو اسے بچوں کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے اور اسی منزل میں بچوں کی لڑکھڑاتی ہوئی زبان،احساسات اور نفسیاتی پہلوؤں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔اور بہت ممکن ہے سید شکیل دسنوی کو بچوں کی قربتوں نے ہی طفلی ادب کی تخلیق پر مائل کیا ہو۔طفلی ادب کے بیشتر ناقدین کا خیال ہے کہ بڑوں کے ادب سے بچوں کا ادب تخلیق کرنا کہیں دشوار ہے۔چونکہ یہاں موضوعاتی طور پر بچوں کی دلچسپی اور زبان کی نرمی اور بہاؤ کا اس حد تک خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ان کے حوالے سے قرطاس پر قدم جمانے والی ہر تخلیق فوری طور پر ان کو یعنی بچوں کو متوجہ کر سکے،اس لئے شاعر کو طفلی ادب تخلیق کرتے ہوئے مزید غور وخوض کی مشقت سے گزرنا پڑتا ہے۔

گزرے ہوئے وقتوں میں چند موضوعات سے ہی کام چل جاتا تھا لیکن اس انٹرنیٹ کے دور میں بچوں کو بندر،بھالو کے قصوں سے کلّی طور پر بہلانا مشکل ہے اور الکٹرونک میڈیا کی برق رفتار ترقی نے بچوں میں بزرگوں سے سوال کرنے کی قوت اور حوصلے کو ابھار دیا ہے اور آنکھ بند کر کے بزرگوں کی ہر بات پر یقین کرنے کی روایت کو کمزور کر دیا ہے۔اور یہ سچائی سید شکیل دسنوی کے اندر پوری طرح پاؤں پسار چکی تھی۔تبھی توانھوں نے بچوں پر لکھتے ہوئے جانوروں کی فہرست کو طویل تر کردیا،اور میرے خیال میں کسی بھی طفلی ادب کی کتاب میں جانوروں کی تعداد اتنی نہیں ہے جتنی طفلی ترانے میں موجود ہے۔اوراس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے کہ جس جانور کی لفظی تصویر بنائی جائے اس میں اس کی فطرت بھی نمایاں طور پر ابھاری جائے۔چند شعری تصاویر دیکھیں۔

سانپ بڑا زہریلا ہے   لمبا ہے پھرتیلا ہے
ڈس لے گا ہشیار رہو   بچنے کو تیار رہو

☆

بچھو کی مت پوچھو بات   فتنہ ہے،بس اس کی ذات
ڈنک کبھی جو مارے گا   حال برا کر ڈالے گا

☆

مچھر بھن بھن کرتا ہے   خون کا اس کو چسکا ہے
کاٹے گا اڑ جایے گا   بیماری پھیلایے گا

☆

سر تو ہلائے بولے کم   بھید وہ دل کے کھولے کم
گرگٹ بدلے کتنے رنگ   نیتا جی ہیں دیکھ کے دنگ

مذکورہ چہار مصرعی نظموں میں سانپ، بچھو،مچھر،گرگٹ کی فطرتوں کو فروزاں کر کے جو بچوں کو ------------------ہر خطرناک شے سے -------ہشیار رہنے کا سبق دیا ہے،اس میں برائی اور بھلائی کے مفاہیم کو بھی سمجھنے کی دعوت دی ہے جو معصوم ذہنوں کے لئے بے حد ضروری ہے اور سید شکیل دسنوی نے طفلی ادب کی تخلیق کرتے ہوئے تمام ضروری باتوں کا خیال رکھا ہے۔چونکہ وہ طفلی ادب کی تخلیق سے متعلق مثبت ادبی رویّے کے قائل تھے اس لیے ان کا خیال تھا ادب اطفال کی تخلیق کافی پیچیدہ عمل ہے۔جس کے لئے شاعر وادیب کو بچوں کی ذہنی سطح تک اترنا پڑتا ہے۔ان کی پسند وناپسند کا صحیح تجزیہ جزولازم ہوتا ہے۔ادب اطفال کے حوالے سے سید شکیل دسنوی کی رائے معقولات کے دائرے کی اسیر ہے اس لیے اس کا احترام ضروری ہے۔

لیکن وہ بچوں کی تربیت کے حوالے سے بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ

سوچتے ہیں اور مزید اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ پیش کش کا طریقہ اور انداز بیان کی دلکشی بھی جاذب توجہ ہونی چاہیئے' تا کہ بچوں کو اپنی جانب متوجہ کر سکے' تا کہ لاشعور میں دیرپا نقوش قائم ہو سکیں۔ بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کی ذمہ داریاں یہیں ختم نہیں ہوتی ہیں' آج الکٹرونک میڈیا کا طاقتور جن ان کے قارئین کو HIGH JACK کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس مقام پر سید شکیل دسنوی کی آواز پر کان دھرا جا سکتا ہے۔ کیونکہ الکٹرونک میڈیا کی آندھی تمام دیرینہ صالح اقدار کو خاروخس کی مانند اڑالے جانا چاہتی ہے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو بچوں کے شعروادب کی تخلیق کے تمام وسائل ناکافی احساس کی آغوش میں جا پڑیں گے۔ ادبِ اطفال کے حوالے سے موصوف کے خیالات سے کلی طور پر مفر ممکن نہیں ہے' اس لئے بچوں کے لئے اس طرح کا ادب تخلیق کرنا چاہیے جو ان کی تربیت بھی کر سکے اور ان کے اندر زندگی کی ہر مشکل کو سر کرنے کا جذبہ بھی تشکیل دے سکے' تا کہ وہ آگے چل کر ایک کامیاب انسان بن سکیں۔ سید شکیل دسنوی کی طفلی تخلیقات ان کے خیالات کا جاذب نظر آئینہ ہیں' بچوں میں ہر چمکتی ہوئی چیز کو حیرت سے دیکھنے اور اس کو سوچنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس بنا پر سید شکیل دسنوی نے بھی چاند' سورج اور تاروں کو اپنی تخلیقی گرفت میں لیا ہے لیکن انداز ایسا اختیار کیا ہے جو بچوں کو اپنی جانب راغب کرنے میں کمال کی حد تک چونکاتا ہے۔

چاند تو سب کا پیارا ہے   اس کا روپ نیارا ہے
رتھ پہ کرن کے ہو کے سوار   نیل گگن کو کر لے پار

☆

سورج بن دن رات کہاں   تاروں کی بارات کہاں
سورج سے جگ روشن ہے   چاند تو اس کا درپن ہے

☆

فلک پہ لاکھوں تارے ہیں   دور بہت بے چارے ہیں
جھل مل جھل مل کرتے ہیں   آنکھ میں جادو بھرتے ہیں

چاند' سورج اور تاروں کے حوالے سے یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں بچوں کے مجموعی مزاج کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ مذکورہ نظموں میں بچوں کے ادبی مذاق کا خیال رکھا گیا اور اجالے کی اہمیت کو بہت ہی پیارے شعری انداز میں بچوں کے ذہن و دل میں اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا اعتراف لازمی قرار دینا چاہیے۔ سید شکیل دسنوی نے بچوں کے دیرینہ دوستوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔

بلّی شیر کی خالہ ہے   آفت کی پرکالہ ہے
اس کو کسی کا کب ہے ڈر   گھر کو سمجھے اپنا گھر

☆

کرتب وہ دکھلاتا ہے   دل سب کا بہلاتا ہے

بھوت سا کالا اس کا رنگ   حملہ کرے تو کردے دنگ
نٹ کھٹ ہے پھرتیلا ہے   پاس نہ جاؤ خطرہ ہے
اچھلے کودے دھوم مچائے   بندر کیا کیا کھیل دکھائے

مذکورہ کتاب کی تمام تر نظمیں طفلی ادب کے حوالے سے جو لفظی خاکہ تیار کرتی ہیں اس میں بچوں کی دل موہ لینے والی شرارتوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ان کی تجسس پسند فطرتوں کو بھی نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی بنا پر سید شکیل دسنوی کی شعری شخصیت کو ادبِ اطفال کے حوالے سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

بچوں کے بہت ہی پیارے اور انوکھے شاعر سراج انور نے بھی کہا تھا' جو صنف بھی بچوں کے دامن دل کو کھینچ لے صحیح معنوں میں وہی ان کا ادب ہے۔ سعید رحمانی سراج انور کے قول کی روشنی میں سید شکیل دسنوی کی مختصر طفلی نظموں کو بچوں کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں' جس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جہاں تک ان مختصر نظموں کی ہیئت کا سوال ہے سو یہ دو بیتی کا ایک فارم ہے۔ اس لحاظ سے مذکورہ مجموعے کو دو بیتی کا اول مجموعہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ☆☆☆

(سید شکیل دسنوی کا شعری آفاق)

کے رنج و غم میں شریک ہوجاتے ہیں گویا وہ ان کا اپنا درد و غم ہو۔ آدمی تو آدمی' درندے اور زہریلے جانور بھی حملہ کرنا ترک کر دیتے ہیں۔ بقول شخصے سیلاب زدہ علاقے میں دو افراد درخت کی جس شاخ پر پناہ گزیں تھے اسی شاخ کے آخری سرے پر ایک کالا ناگ بھی پناہ گزیں تھا۔ لیکن اس مصیبت کی بیلا میں ناگ نے ڈسنا چھوڑ دیا تھا اور وہ آدمی کے رنج و غم میں برابر کا شریک تھا۔

جو ہو سکے تو ذرا جی کے دیکھ لے مجھ میں۔ فلک پہ رہ کے بہت ناشناس رہتا ہے

کبھی کبھی زندگی میں ایسی ساعت گزرتی ہے کہ بے ساختہ دل سے اس طرح کا شعر نکل آتا ہے۔ آدمی جسے اللہ نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے۔ اسے بہت سے معاملات میں خود مختار بنا رکھا ہے' پھر بھی یہ اشرف المخلوقات مجبورِ محض ہے۔ واقعی آدمی کا آدمی کی طرح زیست کرنا نہایت مشکل امر ہے۔

اس قدر ٹوٹا ہوا ہے یہ کبھی سوچا نہ تھا
ہم نے جب تک پاس سے اس شخص کو دیکھا نہ تھا

ٹوٹا ہوا شخص کون ہے؟ غم ہائے روزگار کے ہجوم میں گھرے ہوئے شاعر کا سامنا کبھی "ٹوٹے ہوئے شخص" سے ہوا ہی نہیں۔ کبھی غمِ جاناں کی کسک کبھی غمِ دوراں کی کسک جو دفتر کی میز سے بالیں تک ہمزاد کی طرح ساتھ ساتھ لگی رہتی ہے' اسی چکر ویو میں ایک دن اچانک شاعر کا سامنا "ٹوٹے شخص" سے ہوجاتا ہے۔ شاعر یہ دیکھ کر دم بخود رہ جاتا ہے کہ غم جاناں اور غم دوراں نے مل کر اسے کس قدر توڑ کر رکھ دیا ہے۔ شاعر کی شکل و شباہت ایسی مسخ ہو چکی ہے کہ آئینہ خانہ بھی حیران ہے۔ یہ آج کے عہد کی شناخت بھی ہے اور ہمارے عہد کا المیہ بھی۔ ☆☆☆

کانٹوں سے کچھ گلہ نہ مجھے پھر رہا جناب   پھولوں سے دل پہ زخم کچھ ایسا لگا جناب

ابرار نغمی

رائسین (ایم۔پی)

موبائل۔09424433844
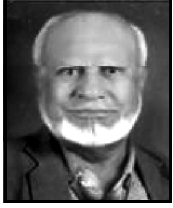
''سانجھ بھئی چودیس'' پر ایک نظر

غزل گزشتہ دوسو سال سے اُردو شاعری کی آبرو بنی رہی اور عہد حاضر میں بھی سب سے زیادہ شعراء غزل کی زلف کے ہی اسیر نظر آتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی ایسے بہت سے شعراء کا کلام نظر سے گذرا ہے جنھوں نے غزل سے ہٹ کر دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور نظم، رباعی اور قطعہ کو اپنی فکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس سے ہٹ کر چند اصناف سخن دیگر زبانوں سے اُردو ادب میں داخل ہوئی ہیں جن میں 'دوہا' اور 'گیت' ہندی سے، 'سانیٹ' انگریزی سے اور 'ہائیکو' ترائیلے جاپان سے۔ آزادی وطن کے بعد خصوصاً ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے لیکر عہد حاضر تک اُردو شاعری کے منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ شعراء کی خاصی تعداد ہے جنھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم اور دوہا کو بھی اپنی فکر و خیال اور احساس و جذبہ کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ لیکن اس ازدحام میں جن چند شعراء نے دوہا گوئی میں طبع آزمائی کر کے ممتاز مقام پایا ہے اُن میں شکیل دسنوی بھی ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

شکیل دسنوی غزل گوئی میں اپنے چار مجموعہ ہائے کلام (۱) زندگی اے زندگی (۲) تنہا تنہا (۳) کتنی حقیقت کتنا خواب اور (۴) دلِ نا آشنا' کے ذریعہ اعزاز یاب بھی ہیں۔ موصوف کا زیرِ نظر مجموعہ ''سانجھ بھئی چودیس'' کے عنوان سے ہی یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ کتاب 'دوہا' پر مشتمل ہوگی کیوں کہ عنوان نابغۂ روزگار شاعر حضرت امیر خسرو کے مشہور زمانہ دوہا کے مصرعہ ثانی کا نصف ہے۔ ۲۰۰۲ء میں شائع مجموعہ ''دوہا رنگ'' مرتب و مولف ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور شاہد جمیل نے امیر خسرو سے لیکر ولی وحشی تک میں تقریباً ڈیڑھ سو دوہے شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شاہد میر اور ابرار کرتپوری کی کتب بھی دوہوں پر مشتمل ہے جو گزشتہ ۲۱۰۲ء میں شائع ہوچکی ہیں۔ شکیل دسنوی کی مذکورہ کتاب ''سانجھ بھئی چودیس'' کے مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ موصوف کو دوہا گوئی پر قدرت حاصل ہے۔ دوہا کی مخصوص اور متعینہ بحر ۱۳+۱۱ = ۲۴ ماتراؤں کے اوزان پر نہ صرف پورے اُترتے ہیں بلکہ دلچسپ پیرایۂ اظہار اور سلیس و سادہ زبان کے وصف سے قاری کی توجہ بھی مرکوز کرتے ہیں۔ اگر چہ دوہوں کا نفس مضمون بہ الفاظ دیگر موضوعات کے اعتبار سے دیگر دوہا گو شعرا سے ہٹا ہوا یا زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اُن (شکیل دسنوی) کے دوہے بھی اخلاقی، معاشرتی، سماجی اور عشقیہ موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ زبان بے حد شگفتہ اور شیریں جسے ہندی شبدوں کی آمیزش نے اور پرکشش بنا دیا ہے۔ اُردو میں ہندی کے الفاظ اور روزمرّہ کا خوبصورت امتزاج ہے جو متاثر کرتا ہے۔ فنی چابکدستی یعنی الفاظ کے دروبست، برمحل استعمال سے یہ دوہے دلکش اور لائق مطالعہ بن گیے ہیں۔ ترسیل کا کوئی مسئلہ قاری کے سامنے نہیں ہے۔ جو کہا گیا ہے وہ پورا پورا قاری کے دل و دماغ میں اُتر جاتا ہے۔ دوہا کے علاوہ شکیل دسنوی کی کتاب ہذا میں دوہا گیت، دوہا غزل اور کہہ مکرنیاں بھی شامل ہیں جن کا اپنا الگ رنگ اور ذائقہ ہے جس سے حلاوتِ کلام میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

بحیثیت مجموعی کتاب میں شامل جملہ تخلیقات غزل کے دلدادہ حضرات کیلئے توجہ کا مرکز بنیں گے۔ ایسے ہزاروں بلکہ لاکھوں قارئین جو غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن کو بھی پسند کرتے اور پڑھتے ہیں، اُن کو یہ مجموعہ ضرور پسند آیے گا اور اُن کے ذوق شعری کی تکمیل و تسکین کا موجب بنے گا نیز پذیرائی کا مستحق بھی ہوگا۔ میں شکیل دسنوی صاحب کو اس عمدہ دلچسپ اور افادیت سے بھرپور مجموعہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ ان کی مغفرت فرمایے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔ آمین۔ ☆☆☆

شکیل دسنوی کے چند خسرو رنگ دوہے

دل کے نازک شیشے پر یہ چوٹ پڑے گی، سوچ ذرا
پنگھٹ پر اک پردیسی سے دیکھ نہ گوری نین لڑا
سنبھل کے چلنا ٹوٹ نہ جایے گوری دل کا یہ درپن
پریت کے رستے ٹیڑھے میڑھے، اور جوانی ہے چنچل
مان بھی لے اب او ہرجائی، پریت کی ریت نبھاتی جا
جنم جنم سے ترس رہا ہوں، من کی پیاس بجھاتی جا
ہاتھ میں گاگر، چال قیامت، اس پہ چھلکتا تیرا روپ
کس کے دل کی دھڑکن بن گئی تیرے پایل کی جھنکار

☆☆☆

سید نفیس دسنوی
PlotNo.D-205,Sector-6
CDA Colony.Cuttack-753014
Mob-9437067585

میرے بھائی جان سید شکیل دسنوی (مرحوم)

آج بڑی ہمت کے بعد قلم اٹھایا ہے کہ اپنے شفیق بھائی جان سید شکیل دسنوی مرحوم (بھائی صاحب کو مرحوم لکھتے ہویے ہاتھ کانپتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے) سے جڑی لگ بھگ نصف صدی کی یادوں کے کچھ حصوں کو قلمبند کرسکوں۔ یادوں کا ایک بے کراں سمندر ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں، اور کہاں ختم کروں۔ بھائی صاحب کی یادوں کا یہ سلسلہ تقریباً نصف صدی سے کچھ زائد عرصہ پر محیط ہے، جو میرے بچپن اور بھیا کے لڑکپن کا زمانہ ہوا کرتا تھا۔ جب انھوں نے پہلی بار ادبی سفر میں قدم رکھا تھا، اور ان کی تخلیقات ''کھلونا'' دہلی ''کلیاں'' ''پیام مشرق'' دہلی، اور ''چندا ماما''، وغیرہ بچوں کے رسالوں میں شائع ہونا شروع ہوئی تھیں۔ ان رسائل میں اپنی تخلیقات دیکھ کر بھائی صاحب کو جتنی خوشی ہوتی اس سے زیادہ ہم بھائی بہنوں اور ان کے ہم جماعتوں کو ہوتی۔ ہم سبھی بھائی بہن اُن کہانیوں کو گھنٹوں پڑھتے اور لطف اندوز ہوتے۔ پھر رفتہ رفتہ اُن کا رجحان افسانوں اور بالآخر شاعری اور خصوصاً غزلوں کی طرف ہوتا چلا گیا۔ اور ان کی تصنیفات پچھلی صدی کی چھٹی دہائی کے اہم ترین رسائل جیسے ''پیام مشرق دہلی'' ''بیسویں صدی دہلی'' ''شمع دہلی'' ''صبح نو پٹنہ'' ''جمالستان دہلی'' ''شاعر ممبئی''، وغیرہ میں تواتر سے اشاعت پذیر ہونے لگیں اور اُن کے مداحوں کی ایک بڑی تعداد اُن کی ہمت افزائی کے لیے آگے آگئی۔ شاعری کا یہ دور بی۔ ایس سی (کیمسٹری) کی طالب علمی کے زمانے سے ہوتا ہوا انجینئرنگ کے کورس تک، اور پھر وہاں سے سروس کی زندگی، پھر سبکدوشی اور مابعد سبکدوشی تک پوری آن بان اور شان سے جاری رہا۔ خصوصاً انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران بھیا نے کورس کی کتابوں اور شاعری کی کتابوں کے درمیان بہت اعتدال قائم رکھا۔ تعلیم پر بھرپور توجہ دی اور انجینئرنگ امتیازی نمبروں سے پاس ہویے۔ انجینئرنگ جیسے خشک نصاب، اور اردو شاعری جیسی صنفِ لطیف میں یہ ہم آہنگی بھی خوب رہی۔

طالب علمی کے زمانے سے بھیا مرحوم کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ چونکہ اس زمانے میں مالی کشادگی اتنی نہیں تھی اس لیے وہ اپنے ہم جماعتوں اور رفیقوں سے کتابیں شییئر کر کے پڑھتے تھے۔ ان ہم جماعتوں اور رفیقوں میں ڈاکٹر مسعود علی خاں، سعید رحمانی (موجودہ اڈیٹر ادبی محاذ)، جمال الدین چودھری، سرور خاں (ریٹائرڈ او۔اے۔ایس)، یعقوب خاں (ریٹائرڈ جیلر)، شہاب الدین احمد، آنجہانی کلبیر سنگھ اور اردو کے دیگر شیداء شامل تھے۔ یہ سب ''امدادِ باہمی'' کے اصول پر رسالوں، ناولوں اور افسانوں کی کتابوں کا آپس میں لین دین کیا کرتے تھے۔ ناولوں میں فیاض علی، اے۔ آر۔ خاتون کے مہماتی اور رومانی ناول، صادق حسین سردھنوی، عبد الحلیم شرر اور نسیم حجازی کے تاریخی ناول، ابن صفی اور شکیل جمالی کے جاسوسی اور رومانی ناول، خان محبوب طرزی اور تیرتھ رام فیروز پوری سائنسی اور جاسوسی ناول، رسائل میں کھلونا، کلیاں، پھلواری، چاند، آستانہ، دین و دنیا، پیامِ مشرق، شمع، شمع، جمالستان اور بہت سے دیگر رسالے شامل تھے۔ ان دوستوں کے پاس اتنی کتابیں اور رسائل جمع ہوگیے کہ متفقہ فیصلے پر ایک لائبریری بھی قائم کردی جس کا نام ''اردو لائبریری'' رکھا۔ بخشی بازار کٹک جی۔ پی۔ او کے سامنے یہ لائبریری ایک کرایے کے مکان میں قائم کی گئی تھی جس کے صدر بھیا تھے اور سکریٹری ڈاکٹر مسعود علی خاں۔ شام کو طلبہ، شعرا اور اردو کے دیگر شوقین حضرات یکجا ہو کر مطالعہ کرتے تھے۔ شعرا میں حضرت امجد نجمی، عبدالباری حافظ، عبدالصمد پریمی، عبدالصمد واصفؔ، حکیم عبدالرحیم نشترؔ وغیرہ اکثر و بیشتر اس لائبریری میں آیا کرتے تھے اور لائبریری قائم کرنے پر بھیا اور ان کے رفقائے کار کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔

ہم پانچ بھائیوں اور دو بہنوں میں بھیا سب سے بڑے، اور راقم چوتھے نمبر پر ہے۔ پھر بھی شروع ہی سے ہم دونوں میں ذہنی قربت، اور مزاج میں ہم آہنگی رہی۔ وجہ شعر و ادب میں مشترکہ شوق و ذوق ہی تھا۔ یہ سلسلہ طالب علمی کے دور سے شروع ہو کر آخر آخر تک قائم رہا۔ شکیل بھائی جان میرے صرف مشفق اور ہمدرد بڑے بھائی نہ تھے، بلکہ استادِ محترم بھی تھے، جن کی رہنمائی اور ذہن سازی نے میرے اس ادبی سفر کو بہت حد تک آسان کردیا۔ اس ادبی سفر کے شروعاتی دور میں بھائی جان کی ہمت افزائی، بھرپور رہنمائی اور بے تکان اصلاحِ سخن میرے لیے ایسی مشعلِ راہ ثابت ہوئی کہ اس کی روشنی نے میرے سفر کو قدرے آسان کردیا جس کے لیے میں تا حیات ان کا ممنون و مشکور رہوں گا۔

شہر کٹک کے نیئے ٹاؤن شپ سی۔ ڈی۔ اے (C.D.A Colony) میں ہم تمام بھائیوں کے مکانات قریب قریب ہونے کی وجہ سے ہر دوسرے یا تیسرے دن ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ قائم رہا۔ اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر، رسالوں اور کتابوں کا لین دین، اور ادبی مسائل پہ سیر حاصل گفتگو کے مواقع نصیب ہویے۔ یہ سلسلہ ان

کے حینِ حیات تک قائم رہا۔ یہاں یہ بھی بتا تا چلوں کہ بھائی صاحب کے منصوبہ کے مطابق اس نئے ٹاؤن شپ کی تعمیر ہوئی ہے۔اس وقت وہ حکومتِ اڑیسہ کے تحت سپرنٹنڈنگ انجینئر کے عہدے پر فائز تھے۔

بھائی جان مرحوم سے زندگی میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ان کی بہت سی اچھی عادتوں کو اپنایا۔مثال کے طور پر قلم کاغذ ہمیشہ ساتھ رکھنا' ادبی امور میں دلچسپی لینا اور اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت وغیرہ وغیرہ۔ میں نے انھیں بے پناہ منصبی مصروفیات کے دوران (بھیا اڈیشہ سرکار میں پبلک ہیلتھ محکمے میں اسسٹنٹ انجینئر سے ترقی پا کر اکزیکٹو انجینئر' اور آخر میں سپرنٹنڈنگ انجینئر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے) سرکاری ٹور میں سفر کرتے وقت' جیپ میں بیٹھے بیٹھے زیرِ لب غزلیں گنگناتے' اور اشعار کو پاکٹ ڈائری میں نوٹ کرتے بار ہا دیکھا ہے۔اس سلسلے میں اکثر کہا کرتے کہ وہ ''آمد'' کی شاعری کے قائل ہیں۔''آورد'' کی شاعری سے احتراز کرتے ہیں۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی اُن کا یہی حال تھا۔کبھی کبھی تو مہینوں ایک شعر بھی کہنے کا موڈ نہیں بنتا' اور کبھی کبھی ایک دن یا ایک رات میں کئی کئی معیاری غزلیں ہو جاتیں۔ایسی ہی شاعری کو وہ الہامی اور سچی شاعری مانتے اور ''آمد'' کی شاعری میں بھی ان کا عجیب حال تھا' کہ اُن کی زیادہ تر معیاری اور یادگار غزلیں اور دیگر تخلیقات آدھی رات کے بعد' اور کبھی کبھی تو رات کے بالکل آخری پہروں میں قلم بند ہوا کرتیں۔غالباً اسی لیے انھوں نے کہا ہے:

آتے ہیں جیسے غیب سے افکار نو بہ نو۔ مجھ کو تو شعر گوئی بھی پیغمبری لگے

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مرحوم حسبِ عادت سرہانے ہمیشہ قلم اور ڈائری رکھ کر سوتے' اور رات کے پچھلے پہر جب نیند اچٹتی اور خوبصورت معیاری اشعار کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا تو فوراً بیڈ لائٹ آن کر کے قلم ڈائری سنبھال لیتے۔اس پر کبھی کبھی بھابھی جان مرحومہ کو کوفت بھی ہوتی' اور وہ ہلکے پھلکے انداز میں معترض بھی ہوتیں۔مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بھیا کی سب سے پہلی سامع اور سب سے بڑی مداح بھی وہی تھیں۔ایسی بہت ساری غزلوں کا ذکر انھوں نے مجھ سے کیا ہے' جو ان ہی لمحات میں مکمل ہوئی ہیں' اور بطور خاص اپنی بے حد مقبولِ عام نعت پاک ''یٰسین لقب' یٰسین لقب'' کا تذکرہ کیا تھا۔جو خالصتاً ''آمد'' والی شاعری کا معاملہ تھا۔مگر اُس کے ساتھ انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ The best is yet to come۔یادوں کے جھروکوں سے جب بھی جھانکتا ہوں تو ماضی کی ان گنت کھٹی میٹھی یادیں ذہن کے پردے پر رقص کرنے لگتی ہیں۔ بھائی صاحب سے ذاتی اور ادبی وابستگی کے تارگزشتہ پانچ چھ دہائیوں سے جڑے ہوئے تھے۔ان کے ذہن میں علم وادب کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا۔انھوں نے راقم کی نہ صرف یہ کہ ادبی رہنمائی اور ذہن سازی کی بلکہ ایک استادِ کامل کی طرح ادب کے اسرار و رموز سے روشناس بھی کرایا۔ رسالوں اور مجلّوں میں تخلیقات کی اشاعت کے طور طریقے' مشاعروں میں پڑھنے کے لیے صحیح غزلوں کے انتخاب کا مسئلہ' مشاعروں میں سامعین کی مزاج شناسی کے طریقے' ان کی پسند اور نا پسند کا لحاظ' اختصار سے مشاعرے پڑھنے کا گُر' اور اختتام پر سامعین میں تشنگی چھوڑ آنے کی ہدایت وغیرہ وغیرہ۔اپنا کلام پیش کرتے وقت بھائی صاحب بے جا تمہید سے گریز کرتے۔وہ اس بات کے قائل تھے کہ ''شاعر کا شعر ہی اُس کا تعارف ہے''۔راقم کا پہلا شعری مجموعہ ''حرف جادواں'' انھیں کی ترتیب وتدوین میں ان کے مشوروں کے عین مطابق ان کی نگہداشت میں اشاعت پذیر ہوا۔اور الحمد اللہ خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔اسی طرح احقر کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ''نور حرا'' مکمل طور پر مرحوم کی اصلاح کے بعد ان کے بتائے ہوئے طریقوں پر اشاعت کے لیے بالکل تیار ہے۔اس نعتیہ مجموعے کا عنوان بھی انھیں کا دیا ہوا ہے۔اور اُس کے ایک فلیپ پر بھائی صاحب مرحوم کے مختصر تاثرات اور دوسرے فلیپ پر پیر جمالیات ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب کے تاثرات قلم بند ہیں۔دلی قلق اور شدید ملال اس بات کا ہے کہ خاکسار کا یہ مجموعہ ان کی حیات میں منظر عام پر نہ آسکا' جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ بابا سائیں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب کے ذکر سے یہ بھی یاد آیا کہ ان کی فرمائش پر ''ادبی محاذ'' کٹک کا خاص نمبر' جو بابا سائیں کے لیے مخصوص تھا' اُس کی مکمل ترتیب وتدوین بھیا مرحوم نے دورانِ علالت بڑی سخت محنت اور جانفشانی سے انجام دی تھی۔یہ خاص نمبر بہت مقبول ہوا' اور آج بھی اُس کی دستاویزی حیثیت مانی جاتی ہے یہاں تک کہ پاکستان سے بھی کچھ ریسرچ اسکالروں نے اس کی کاپیاں طلب کیں۔چونکہ اس کی ایک بھی کاپی نہیں بچی تھی اس لیے انھیں ادبی محاذ کے ویب سائیٹ کا پتہ دے دیا گیا کہ اسی سے استفادہ کریں۔جن حضرات کو ادبی محاذ کی مذکورہ کاپی کی ضرورت ہو وہ اس ویب سائیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔پتہ ہے:

www.adbimahaz.yolasite.com بہر حال اس شمارے کے حوالے سے بھائی صاحب مرحوم کی صلاحیتوں کا اعتراف خود ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب نے بھی فون پر کئی بار کیا تھا۔

مجھے خوشی اس بات کی بھی ہے کہ شکیل بھائی مرحوم کے مداحوں اور خیر خواہوں نے جس طرح ۱۹۶۰ء کی دہائی سے لے کر لگ بھگ ۲۰۰۰ء تک ان کی شاعری کی پذیرائی کی' ان کی غزلوں کو پسند کیا' شعری مجموعوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مشاعروں میں داد وتحسین سے نوازا' اسی طرح ۲۰۰۰ء سے لے کر آخر دم تک اُن کی نثری تخلیقات کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی کی' بلکہ شاعری سے بھی زیادہ پسند کیا' اور ترجیح دی۔ادبی محاذ کے اداریئے' شعراء وادیبوں کی کتابوں پر ان کے بے لاگ تبصرے اور تنقیدیں' ہندوستان بھر کے معتبر رسائل میں اُن کے مختلف النوع مضامین اس کے جیتے جاگتے ثبوت ہیں۔شعرا اور افسانہ نگاروں کے تذکرے کو انھوں نے ''بازدید'' اور ''اندازِ بیاں اپنا'' میں یکجا کر کے کتابی شکل دی' جسے قارئین نے بہت پسند کیا۔''ادبی محاذ'' کے اداریوں میں انھوں نے ہمیشہ ہٹ کر کچھ نئی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔اس

طرح تبصروں اور تنقید نگاری میں بھی بھیا مرحوم نے بڑی دیانت داری سے کتاب کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد تبصرے کیے ہیں۔ اس صنف میں انھوں نے ہمیشہ تنقید نگاری کے اصولوں اور ضابطوں کو ملحوظِ خاطر رکھا اور بے جا تنقیص سے احتراز کیا۔ ''تنقید برائے تنقید نہ کہ برائے تنقیص'' کے قائل تھے۔ ہر ایک مجموعہ یا کتاب پر گہرائی سے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد ہی انھوں نے قلم اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ شکیل نوازوں نے ہمیشہ اُن کے تبصروں کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا اور خوب سراہا۔ متعدد شعرائے کرام کے شعری مجموعوں پر انھوں نے بڑی ذمہ داری سے پیش لفظ لکھے جو صاحبِ مجموعہ کو بے حد پسند بھی آیے۔ کئی ایسے مجموعے منظرِ عام پر آ کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں اور کچھ اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

آنکھوں میں گویا یادوں کی بارات سجی ہے۔ ماضی کی ان گنت کھٹی میٹھی یادیں ہی میرا سرمایۂ حیات ہیں۔ اُن سے ہر ملاقات پر کچھ نہ کچھ نئی بات اُبھر کر آتی اور کچھ نہ کچھ سیکھنے کا تجربہ ہوتا۔ میں نے ''کھٹی میٹھی'' یادیں اس لیے کہا کہ کبھی کبھی کسی ادبی نکتے پہ ہم دونوں میں اختلاف رائے بھی ہو جاتا تھا مگر تہذیب و ادب کے دائرے میں۔ میرا ماننا ہے کہ اختلاف رائے تو سرشت انسانی کا اہم حصہ ہے اور یہ ضروری نہیں کہ کسی ایک موضوع پر ہر دو شخص کی آراء یکساں ہوں۔ مگر راقم نے ہمیشہ بڑے بھائی کا لحاظ اور استادِ محترم کے مقام کا احترام قائم رکھا۔ ویسے بھی خاکسار ہمیشہ اپنے اس شعر پر کاربند رہا ہے کہ:

اختلاف رائے اگر حد میں رہے تو ٹھیک ہے
ورنہ اک دن ہاتھ ملتی دوستی رہ جایے گی

شاعری کے متعلق ہمیشہ ان کی یہی رائے رہی کہ یہ اشاروں اور کنایوں میں کہنے کی چیز ہے۔ اور وہ بھی ایسی کہ شاعر کے دل سے نکلے اور سامع کے دل میں جا اُترے ''بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے''۔ اشعار میں اکہرے پن کے قائل نہ تھے بلکہ گہرائی اور گیرائی کا بہت خیال رکھتے۔ ایک غزل کہہ لینے کے بعد مہینوں اسے دوبارہ سہ بارہ تنقیدی نظر سے دیکھتے۔ ہمیشہ کہتے کہ غزلوں اور دیگر شعری تخلیقات میں ہمیشہ برجستگی اور درستگی کی گنجائش رہتی ہے۔

آخر میں اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ ماشاءاللہ مرحوم شکیل دسنوی کے مداحوں اور شکیل نوازوں کی اتنی بڑی تعداد اُن کے سانحہ ارتحال پر خانوادۂ منظر حسن سے بذریعہ فون، موبائل، ایس ایم۔ایس اور ای۔میل سے رابطہ میں آئی کہ وفورِ جذبات سے اہلِ خانہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ مرحوم کے کرم فرماؤں نے ہر طرح سے اہلِ خانہ کی مزاج پُرسی کی، مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی اور پسماندگان کے حق میں صدق دل سے صبرِ جمیل کی تلقین کی۔ خانوادۂ منظر حسن ان تمام کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتا ہے اور ان کے جذبات کی تہہ دل سے قدر کرتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ بھائی صاحب مرحوم کے دونوں صاحب زادوں انجینئر سید آصف دسنوی اور انجینئر سید راشد حسن نے ناچیز کو بڑا حوصلہ دیا کہ ''ادبی محاذ'' بدستور انشاءاللہ اشاعت پذیر ہوتا رہے گا اور اب مرحوم کی جگہ اُن کے بڑے صاحب زادے انجینئر سید آصف دسنوی رسالے کے سرپرستِ اعلیٰ ہوں گے۔ راقم تو شروع ہی سے ''ادبی محاذ'' سے جُڑا ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ انشاءاللہ بھائی جان مرحوم کا ایک اور شعری مجموعہ جو لگ بھگ مکمل ہے، مگر علالت کے سبب اشاعت پذیر نہ ہو سکا، اُس کی اشاعت کی جایے۔ اور اگر ممکن ہوا تو ''کلیاتِ شکیل'' کی ترتیب و تدوین کی جایے گی انشاءاللہ۔ اس حوالے سے تمام شکیل نوازوں کی دعاؤں کا طالب ہوں۔

اور اب سب سے آخری بات، اپنے موبائل سے بھائی جان سید شکیل دسنوی مرحوم کا نام حزف (Delete) کرتے وقت کس کربناک اذیت کا احساس ہو رہا ہے، اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس دُکھ کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ اس موقع کی مناسبت سے اسی موضوع پر ڈاکٹر کرامت علی کرامت صاحب کی حالیہ نظم ''مُبائل'' مجھے بے حد یاد آ رہی ہے، جو کچھ اس طرح ہے۔

مُبائل میں تمھارا نام اور نمبر ہے محفوظ
مگر تم اس جگہ جا کر بسے ہو
جہاں سے لوٹ کر آتا نہیں کوئی
مُبائل میں یہ نمبر رہ کے آخر فائدہ کیا ہے؟
یہ سوچا بارہا میں نے
تمھارا نام اور نمبر مٹانے کے لیے، چلتی نہیں ہیں انگلیاں میری
یہ کیسے مان لوں میں
کہ تم میرا ''مُبائل کال'' پا کے چُپ رہو گے؟

اسی بہانے سے بھائی جان مرحوم کے چند لازوال اشعار کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں:۔

عمر بھر مہمان بن کر میں یہاں ٹھہرا رہا　　　نام کی تختی مری تھی، یہ مکاں میرا نہ تھا

☆

کہتے کہتے ہم فسانہ زیست کا چُپ ہو گیے۔۔ بزمِ ہستی کی حقیقت وہ نظر آئی کہ بس

☆

چھلک اُٹھیں گی آنکھیں ناگہاں جب ہم نہیں ہوں گے
بہت ڈھونڈو گے ہم کو مہرباں جب ہم نہیں ہوں گے

☆

لاکھ ڈھونڈو گے، مگر مجھ کو کہاں پاؤ گے　　　یاد بن کر کہیں ماضی میں بکھر جاؤں گا

☆

زندگی ہے کھیل کوئی دھوپ چھاؤں کا۔ روشن رُخِ حیات ابھی ہے، ابھی نہیں

☆☆☆

مدہوش بلگرامی
ہردوئی (یوپی)
Mob:08726189282

سید شکیل دسنوی اپنی شاعری کے آئینے میں

سید شکیل دسنوی کا نام اردو شعر وادب کی بستیوں کے لئے نیا نہیں ۔ ان کی شہرت ومقبولیت اور شعری اور نثری تخلیقات ان کی شناخت کی آئینہ دار ہیں۔مختصر الفاظ میں یہ تحریر کردوں تو بہتر معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ان کی وراثت کا ایک حصہ ہے۔ وہ پروفیسر سید منظر حسن دسنوی کے صاحبزادے ہیں۔ان کا وطن قصبہ دسنہ ریاست بہار ہے مگر سکونتِ ثانی کے اعتبار سے شہر کٹک (اڑیسہ) کو اولیت حاصل ہے۔اور معتبر شاعر وادیب' معاون مدیر سہ ماہی ادبی محاذ کٹک (اڑیسہ) سید نفیس دسنوی ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔

سید شکیل دسنوی ایک کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر اور ایک معتبر نثر نگار بھی تھے۔انھوں نے نصف صدی سے زیادہ مدت تک غزل کی زلفوں کو سجایا اور سنوارا ہے۔وادیِ نثر کی آبیاری کی خاطر خونِ دل بھی صرف کیا۔ان کے طویل ادبی سفر کے دوران اردو شعر وادب کو''زندگی اے زندگی''۔''تنہا تنہا''۔''کتنی حقیقت کتنا خواب''۔''دلِ نا آشنا''۔''سانجھ بھئی چودیس''۔طفلی ترانے''۔''بازدید''۔''انداز بیاں'' جیسی کتابوں سے نوازا۔

ان کی شاعری جب مطالعہ سے گزری تو بے ساختہ یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ نئے امکانات کے شاعر ہیں۔ان کے مزاج ولہجہ میں تازہ کاری ہے۔اور خیالات و نظریات' عصری حالات ومسائل کے ترجمان ہیں۔انھوں نے گیت' نظم' دوہا جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی مگر غزلوں میں ان کی ہنرمندی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ مخالفینِ غزل نے اپنی بے لگامی سے غزل کی آبرو کو نیلام کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔وہ ان بدمزاج لوگوں کا وقتی ہنگامہ تھا۔آج اردو غزل کو شاعری میں جو مقام حاصل ہے وہ جگ ظاہر ہے۔اس کی تعریف وتوصیف اور خامہ فرسائی کے لئے ایک الگ سا مضمون قلم بند کیا جاسکتا ہے۔یہاں میں یہ بتا دوں کہ میرے نزدیک غزل اردو شاعری کی بنیاد اور شاعر کے دل کی آواز ہے۔بہر کیف سید شکیل دسنوی کی شاعری انسانی فطرت وطبیعت کو اجاگر کرتی ہے اور زمانے کے خدوخال کی ترجمان بھی ہے۔حقیقت پر مبنی ان کے افکار ونظریات' پاکیزہ جذبات وخیالات اور شاعرانہ صلاحیت کے نمائندہ کچھ اشعار درج کررہا ہوں۔

یہ زندگی ہے کھیل کوئی دھوپ چھاؤں کا — روشن رخِ حیات ابھی ہے ابھی نہیں

شیشہ نمائی کرنے کی اچھی نہیں ہے خو — کر ہی لیا نہ آپ نے دنیا کو خود عدو

پہونچا ہے سوا نیزے پہ آلام کا سورج — تا حدِ نظر سایۂ دیوار نہیں ہے

ریتوں کی آب چاٹتے پایا ضرور تھا — مجھ سے بھی تشنہ کام یہ سایا ضرور تھا

دن بھر جو ساتھ ساتھ تھی دفتر کی میز پر — بالیں پہ رات کو وہی فکرِ معاش ہے

زندہ ہوں مگر زیست پہ اک قرض کی صورت — ناکردہ گناہوں کی سزاؤں کی طرح ہوں

اچھی اور زندہ شاعری کے تعلق سے اربابِ علم وادب کے احساس وفہم جدا جدا ہیں مگر عام فہم الفاظ وزبان' بے ساختہ دل پر نقش ہونے والا طرزِ بیان جو برسوں کے لئے یادوں میں محفوظ ہوجائے' جس میں سادگی وسلاست کا جواز بھی ہو اسے زندہ شاعری کا نام دیا جاسکتا ہے۔سید شکیل دسنوی کے یہاں یہ خصوصیات بہت نمایاں ہیں۔سہل ممتنع میں جدت کے حامل اچھوتے خیالات کے ان اشعار پر نظر جاتی ہے تو شاعر کے قلم اور افکار کے لئے ماشاء اللہ زندہ باد' پائندہ باد کا نعرۂ تحسین بلند ہوتا ہے۔

میں خود میں ٹوٹتا بنتا عمل ہوں — ابھی خود سے بہت نا آشنا ہوں

زباں ہی دیدۂ تر کی سمجھ سکا نہ کوئی — ہر ایک اشک کے قطرے میں اک فسانہ تھا

جو ہوسکے تو ذرہ جی کے دیکھ لے مجھ میں — فلک پہ رہ کے بہت ناشناس رہتا ہے

آج تو جینا بھی اک معجزہ سے کم نہیں — یہ کرشمہ سازیوں کے دور کا تحفہ سہی

مجبور ہوں پتھر کے خداؤں کی طرح ہوں — میں وقت کے آذر کی خطاؤں کی طرح ہوں

ایک طرف سید شکیل دسنوی کے یہاں چھوٹے بڑے مضامین اور موضوعات کو غزل کا لہجہ دینے کا اچھا شعور ہے اور دوسری طرف جذبات وخیالات کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی ہے۔ان کی شاعری میں حساس وبیدار ذہن کے رجحانات، دردِ دل کی تڑپ اور عصرِ حاضر کی ترجمانی روزمرّہ کے عام فہم الفاظ میں ملتی ہے۔انہوں نے صحت مند شاعری کی ہے۔وہ ایک باشعور اور نرم لہجے کے انسان تھے۔جو کچھ کہتے تھے خوب چھان پھٹک کر کہتے تھے۔

یہ طوفاں جبر واستبداد کی بنیاد ڈھائے گا
چھلک جائے گا جب خونِ شہیداں ہم نہ کہتے تھے

ٹوٹے پھوٹے ارمانوں میں رہتے ہیں | ہم تو دل کے ویرانوں میں رہتے ہیں

مٹی کے کھلونوں سے کیا کھیل یہ کھیلے ہو۔ خود اس کو بناؤ ہو خود توڑ کے دیکھے ہو

پیاس اپنی تو بہت دور نکل جاتی ہے۔ ان سرابوں کا کرشمہ نہیں دیکھا جاتا

شکیل بڑھ کے بکھیر و یہ سارا شیرازہ۔ یہ مجھ میں کون ہے اکثر ابھارتا ہے مجھے

تلخی اگر جمود کی صورت ہو درمیاں۔ احساس پر سکوت کا لمحہ صدی لگے

جو ہو رسائی تری ذات تک کیسے ہو۔ مرے وجود پہ خاکی لباس رہتا ہے

عربی اور فارسی کا برمحل استعمال اور تراکیب کو برتنے میں سید شکیل دسنوی کو مہارت حاصل تھا مگر ہندی زبان کے لفظوں، محاوروں کو کتنے سلیقے سے غزل کے گنگا جمنی رنگ میں سمویا گیا ہے۔

کالے کوسوں دور سے جب ہم پہنچے ہیں اس گوری کے گاؤں
برہ کی ماری ان آنکھوں میں جل تھل اچھا لگتا ہے
بھور کی بیلا نیند سے بوجھل ان متوالی آنکھوں میں
کیا جانے کیوں پھیلا پھیلا کاجل اچھا لگتا ہے
سناٹے کا سینہ چیرے جب کوئل کی بیاکل کوک
دل میں کیسی ٹیس اٹھائے بھیگی بھیگی راتوں میں
لوگوں نے آکاش میں دیکھا ہم کو اس سے کیا مطلب
اپنی تو تب عید ہوئی جب ان بانہوں میں سمٹا چاند

سید شکیل دسنوی کے افکار و تخیل میں گہرائی اور تازہ کاری ہے۔ اسلوب و بیان کی تہہ داری نے شاعری میں نکھار پیدا کیا ہے۔ صاف ستھری زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی غزلوں میں کیف و اثر کا اچھوتا پن ہے جو احساسات کو متاثر کرتا ہے۔

☆☆☆

("شکیل دسنوی ایک ناقابلِ فراموش قلمکار" کا بقیہ)

اپنی علمی تشنگی، راتوں کی بے خوابی، کچھ کر گزرنے کی تڑپ، دل کا کرب، سیماب صفت کسک، دل کی بے تابی، دھڑکنوں کا زیر و بم، شب بیداری اور اپنے ادھورے خوابوں کو غزل کا نام دے کر اپنے جذبوں کی ترجمانی سید شکیل دسنوی نے کچھ اس طرح کی ہے۔

دیدۂ پُر آب ہے میری غزل | اک شکستہ خواب ہے میری غزل
یہ تڑپ یہ تشنگی ہر شعر میں | ماہیٔ بے آب ہے میری غزل
کرب میرا ایک موجِ تہہ نشیں | صورت سیماب ہے میری غزل
یہ کسک یہ دھڑکنیں یہ زیر و بم | اک دلِ بے تاب ہے میری غزل
میں تو شاعر شب گزیدہ ہوں شکیل | اک ادھورا خواب ہے میری غزل

بنیادی طور پر شاعر حساس ہوتا ہے۔ اس کا احساس ایک عام آدمی کے احساس سے لازماً شدید تر ہوتا ہے جس کے بغیر وہ کسی بات کو اس کی اصلیت سمیت پیش نہیں کر سکتا۔ سید شکیل دسنوی نے اپنے شعری مزاج میں احساس کا تاثر کچھ یوں واضح کیا ہے۔

اپنی حالت دیکھ کر یوں آنکھ بھر آئی کہ بس۔ ہم نے بھی جرمِ وفا کی وہ سزا پائی کہ بس

سید شکیل دسنوی کی شاعری میں ان کا قنوطی لہجہ ان کے رجائی لہجے پر حاوی نظر آتا ہے پھر بھی ان کا رجائی لہجہ بھی تاثر سے بھرپور ہے۔

بات جو دل میں تھی کچھ اس کا پتا دینا تھا۔ اس نے جب ہاتھ ملایا تو دبا دینا تھا

آتے ہیں جیسے غیب سے افکار نو بہ نو۔ مجھ کو تو شعر گوئی بھی پیغمبری لگے

سید صاحب کی شعر گوئی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندی آمیز الفاظ کا کھلے دل سے استعمال کیا ہے جن میں ہندی کی رومانوی شاعری کے عناصر بھرپور پائے جاتے ہیں، جیسے ہجراں نصیب سہاگن، برہ کی آگ، موسم کی خوش نمائی، پریت کی ریت، پریتم کی بے وفائی، وغیرہ وغیرہ میٹھے میٹھے الفاظ کو اشعار میں اس خوبصورتی سے پرویا ہے کہ ان کی شعر گوئی میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا اضافہ نمایاں طور سے محسوس ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

یہ روپ کا مایا جال نہ بُن | زلفوں میں ہمیں یوں قید نہ کر
آنچل میں کہیں رکتی ہے پون | اس دیس بھر میں اُس دیس بھر میں
حسیں چاندنی ہو کہ ساون کی رُت | کسک اس کے دل میں جگاتی تو ہوگی
کسی کی تصویر کو پہلو میں پا کر | وہ شرما کے خود کسمساتی تو ہوگی

شکیل دسنوی کی شاعری میں اظہار ذات، اظہار کائنات، فکر معاش جیسی تراکیب کا بھی برجستہ استعمال ہوا ہے۔

دن بھر جو ساتھ ساتھ تھی دفتر کی میز پر۔ بالیں پہ رات کو وہی فکرِ معاش ہے

غرض کہ سید شکیل دسنوی مرحوم کا بنیادی رنگ و آہنگ ہی ان کی شاعری کا ماحصل اور ان کے مزاج کی میانہ روی ہے۔ غمِ جاناں ہو کہ غمِ دوراں وہ اپنا توازن نہیں کھوتے نہ اپنے تخیل کو بے لگام چھوڑتے ہیں، اپنے جذبات و خیالات کو سیدھے سادے اشعار اور نکھری زبان میں ظاہر کرنے کی اچھی صلاحیت کے مالک تھے۔ فکر و اظہار کی گہرائی، جذبات کا فنکارانہ اظہار ان کی شاعری کا خلاصہ ہے۔

اردو ادب میں صنفِ شاعری کے تین اور دیوناگری میں دو نیز نثر کے دو خوبصورت مجموعے دینے والا یہ خوش کلام شاعر آج ہم سے بچھڑ چکا ہے۔ چار اپریل ۲۰۱۴ء کو یہ باکمال خوش خصال اور خوش بیان شاعر اس جہان فانی سے کوچ کر کے مالک حقیقی سے جاملا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

میں خود ہی ٹوٹا بنتا عمل ہوں۔ ابھی خود سے بہت ناآشنا ہوں

مجھے امید ہے کہ اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر قاری مرحوم کی مغفرت کی دعاؤں کے ساتھ ان کی شاعری اور نثری کتابوں کو ضرور پڑھے گا۔ اس تعلق سے "ادبی محاذ" اڑیسہ کے مدیر اور اُن مرحوم کے حقیقی بھائی سید نفیس دسنوی سے سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ ☆☆☆

نصر اللہ نصرؔ
ShalimartApartment.3-Satyan
Danish Shaikh Lane.Bakultala
Howrah-711109(W.B).Mob:933996034

سیّد شکیل دسنوی کی دوہا نگاری

سید شکیل دسنوی اردو شعر و ادب کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک بزرگ اور کہنہ مشق استاد شاعر، ادیب اور ناقد ہیں۔ یہ اوصاف اور خوبیاں ان کو وراثت میں ملی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے والد سید منظر دسنوی بھی ایک معتبر اور مستند شاعر وادیب رہے ہیں اور کٹک (اڑیسہ) کی سرزمینِ ادب کو اپنی گرانقدر تخلیقات سے لالہ زار بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ شکیل صاحب نے بھی اس روایت کی پاسداری کی ہے۔ سائنس کا طالب علم ہوتے ہوئے بھی اردو ادب کی زلفِ گیرہ گیر کی شانہ کشی کی ہے۔ نیز اس کے قبائے رنگیں میں ستارے بھی ٹانکے ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات میں حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، گیت دوہا، دوہا غزل، دوہا گیت اور دوہا نظموں کے علاوہ ماہیئے، کہہ مکرنیاں اور دیگر شعری اصناف شامل ہیں۔ ان کی درجنوں کتابیں (شعری ونثری) منظر عام پر آ کر دادو تحسین و پذیرائی کے مرحلوں سے گزر چکی ہیں۔ بقول سعید رحمانی (مدیر ادبی محاذ) ''اکابرین ادب میں سید شکیل دسنوی صاحب کو ایک بلند اور اہم مقام حاصل ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے بھی زائد عرصے سے وہ اپنی تخلیقیت افروزیوں کا جواز فراہم کرتے آ رہے ہیں۔''

بے شک سید شکیل دسنوی صاحب کا شمار بیسویں اور اکیسویں صدی کے کثیر الاشاعت شعرا و ادبا میں ہوتا ہے۔ منصبِ فرائضی سے بحیثیت انجینئر سبک دوشی کے بعد ان کے رہوارِ قلم کی رفتار میں تیزی آئی ہے۔ ان کی تصنیفات میں تنہا تنہا، کتنی حقیقت کتنا خواب، دلِ نا آشنا (شعری مجموعے) طفلی ترانے (بچوں کی نظمیں) باز دید (تبصرہ و تجزیہ)، اندازِ بیاں اپنا (تنقید و تحقیق)، وجدان (ترتیب و تالیف) اور سانجھ بھئی چودیس شامل ہیں۔ 'سانجھ بھئی چودیس' ان کی تازہ تصنیف ہے جس میں دوہے، دوہا گیت، دوہا غزل، دوہا نظم کے علاوہ گیت، نظم، ماہیئے، کہہ مکرنیاں اور منتخب اشعار شامل ہیں۔ میرا موضوعِ بحث موصوف کی دوہا نگاری ہے۔

دوہا کی تعریف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ دوہا دو مصروں پر مشتمل وہ صنف سخن ہے جس کے ہر مصرع میں تیرہ اور گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں۔ پہلے حصے میں تیرہ اور دوسرے میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں۔ یعنی دونوں مصرعوں کے چار حصوں میں پہلے اور تیسرے (سم) میں تیرہ ماترائیں اور دوسرے اور چوتھے حصوں (وشم) میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں۔ دوہے کے اور بھی چھند یا وزن ہو سکتے ہیں مگر ترجیحات اسی بحر متدارک (فعلن فعلن فاعلن فعلن فعلن فاع) کو حاصل ہیں۔

بقول ڈاکٹر آفاق فاخری: ''دوہا اردھ ماترک یا اردھ سم ماترک چھند ہے۔ ماترک چھندوں میں ماتراؤں کی تعداد معین ہوتی ہے۔ اس طرح دوہے کے چار چرنوں میں سب کے اعداد برابر نہیں ہوتے بلکہ اس کے پہلے اور تیسرے چرن میں تیرہ ماترائیں اور دوسرے اور چوتھے چرن میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں۔''

دوہا نگاری کا آغاز کب ہوا اور اس کی اولیت کا سہرا کس کے سر جاتا ہے یہ ایک تحقیق طلب سوال ہے۔ بقول کوثر صدیقی ''ہندی میں اس کے اول نقوش آٹھویں صدی میں ملتے ہیں''۔ عام روایت کے مطابق گیارہویں صدی میں اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ ڈاکٹر آفاق فاخری کی تحقیق کے مطابق امیر خسرو سے پہلے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے دوہے کہے تھے۔ جن کے دوہوں میں صوفیانہ رنگ اور نورانیت کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کے ۱۳۰ دوہے سکھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب میں شامل ہیں۔ قاضی مشتاق احمد کے مطابق امیر خسرو سے لگ بھگ ایک صدی پہلے کبیر داس دوہا کہہ چکے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو سے پہلے جو دوہے کہے گئے ہیں وہ خالص اس زمانے کی بولیوں پر محمول ہیں۔ شاید اسی لیے بیشتر محققین نے امیر خسرو کو ہی دوہے کا پہلا شاعر مانا ہے۔ بقول ڈاکٹر فاخری 'ابھی تک پہلا دوہا حضرت امیر خسرو کے ہی تخلیقی سرچشموں کا رہین منت ہے'۔ ابوذر ہاشمی کہتے ہیں ''اردو میں دوہے کا سلسلہ امیر خسرو سے شروع ہوا''۔ دیگر ادیبوں کی نگارشات میں بھی اس کی تائید ملتی ہے۔ حالانکہ امیر خسرو سے پیشتر کہے گئے دوہوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ چند دوہے ملاحظہ فرمائیں:

من میں لاکھوں من جلئے کہوں تو مکھ جل جائے
جیسے سپنا گونگے کا روئے اور پچھتائے

بڑا ہوا تو کیا ہوا، جیسے پیڑ کھجور۔ پنچھی کو چھایا نہیں پھل لگے اتی دور

مانگن مرن سمان ہے مت مانگو کوئی بھیک
مانگن سے مرنا بھلا یہ ستیہ گرو کی سیک (کبیر داس)

ما یا کو ما یا ملے کر کے لمبا ہا ت
تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات (تلسی داس)

کا گا سب تن کھائیو، چن چن کھییَو ماس
دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس (بابا فرید گنج شکر)

دوہا ایک قدیم صنف سخن اور صوفیانہ افکار و خیالات کا خوب صورت وسیلۂ اظہار ہے۔ جس کو سادھوؤں، سنتوں، صوفیوں اور درویشوں نے خصوصی طور پر اپنایا۔ یہ ہندوستانی عوامی شاعری کی ایک مخصوص صنف ہے جس میں آفاقی صداقتوں، عصری حالات، حقائقِ حیات و کائنات اور پند و نصائح کے موضوعات نظم کیے جاتے ہیں۔ اب تو اس کا دامن غزل کے موضوعات کی طرح وسیع ہو چکا ہے۔ دوہے کا رشتہ بنیادی طور پر ہندی زبان و ادب سے گہرا ہے۔ ہندی الفاظ کی شمولیت سے دوہے کی چمک میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوہے میں رمزیت، اشاریت اور ایمائیت کے علاوہ گہرائی و گیرائی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ بغیر ان کے دوہے میں رعنائی، شگفتگی اور تیکھاپن نہیں آتا۔ چند دوہے اور دیکھیں :

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپ نے سانجھ بھئی چودیس (امیر خسرو)

ایسی بولی بولیے من کا آپا نہ کھویے
اوروں کو شیتل کرے آپو شیتل ہویے (کبیر داس)

نیا گھاؤ ہے پریم کا جو چمکے دن رات
ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات (فراق گورکھپوری)

جیون بھر سنسار میں کرے جو اچھے کام
مر جانے کے بعد بھی رہے اسی کا نام (نادم بلخی)

ساتوں دن بھگوان کے کیا منگل کیا پیر
جس دن جاگے دیر سے بھوکا رہے فقیر

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار (ندا فاضلی)

ہم نے کاٹا عمر کا کیسا یہ بن باس
یہ رامائن کون لکھے کہاں ہیں تلسی داس (تلسی داس)

تال سوکھ پتھر بھیو ہنس کہیں نہ جایے
پچھلی پیت کے کارنے کنکر چن چن کھایے (نامعلوم)

سکھ کے پیچھے دوڑیے کبھی نہ آئے ہاتھ
دکھ ہی سچا میت ہے سدا نبھایے ساتھ (سید شکیل دسنوی)

عصرِ جدید میں دوہا نگاری کی صنف میں چند اکابرین شعرا کے یہاں کافی زود گوئی نظر آتی ہے۔ جن میں بھگوان داس اعجاز، ندا فاضلی، ناوک حمزہ پوری، فراز حامدی، شاہد جمیل، شاہد میر اور نادم بلخی کے نام خصوصی طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ نادم بلخی کے دو دو دوہے کے مجموعے 'جیون درشن (۱۹۸۹) جس میں ۵۳۰ دوہے شامل ہیں اور 'میٹھی میٹھی بولیاں' (۱۹۹۴) جس میں ۶۶۴ دوہے ہیں منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ بھگوان داس اعجاز، جمیل الدین عالی (پاکستان) فراز حامدی اور سراج دہلوی کے بھی دوہے کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور بھی دوہے کے مجموعے منظرِ عام پر آ یے ہوں گے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ صنف دوہا نگاری آج بھی اپنی مقبولیت افادیت برقرار رکھی ہے اور عصرِ حاضر میں دوہا کہنے والوں کی تعداد خاصی بڑھی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ شاہد میر نے دوہوں کا عالمی انتخاب ''دوہے عالمگیر'' شائع کیا ہے جس میں دنیا بھر کے ۱۲۷ شعرا کے دوہے شامل ہیں۔ یہ بارہ سو سالہ دوہے کا انتخاب بھی ہے۔ 'دو رنگ' کے نام سے بھی دوہوں کا انتخاب شائع ہوا ہے جس کے مرتبین ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور شاہد جمیل ہیں۔ دوہا غزلوں کے مجموعے اور انتخاب بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ شمیم انجم واثی نے بھی دوہا غزل کا انتخاب 'مغربی بنگال میں دوہا غزل کا سفر' ترتیب دیا ہے جو منظر عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر رہا ہے۔

سید شکیل دسنوی کا تازہ شعری مجموعہ 'سانجھ بھئی چودیس' اردو منظر نامے پر وارد ہوا ہے۔ جس میں ان کے ۶۰ دوہے کے علاوہ دوہا گیت، دوہا غزل، دوہا نظم اور کچھ نئے شعری تجربے شامل ہیں۔ ان کے دوہوں میں برجستگی، شگفتگی کے علاوہ بندشِ الفاظ کی خوبی، جذبات کی پاکیزگی اور مضامین میں جدت کاری کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ ان کے دوہوں میں دوہے کے ساتوں رنگ (اشور رس۔ حمد، اشور یتا رس۔ نعت، دکھ سکھ رس، پریم رس، ایکتا رس، اپدیش رس اور چرتر رس) عکس ریز ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

ایشور رس :

سارا جگ بھگوان کا جس پر اس کا راج
دُربل یا بلوان ہو سب اس کے محتاج (نادم بلخی)

رب کی مرضی کے بغیر ہلے نہ کوئی پات
کرے ہے مورکھ آدمی بڑی بڑی پر بات

سکھ تیری مسکان ہے دکھ بھی تیرا روپ
تیرے رنگ ہزار ہیں تیرے روپ انوپ (شکیل دسنوی)

ایشور رس :

احمد ان کا نام ہے جو انتم اوتار
لے کر جگ میں ایئے وہ رحمت کے اپہار (نادم بلخی)

(شکیل صاحب کا دوہا اس موضوع پر دستیاب نہیں ہو سکا)

(بقیہ صفحہ 28 پر)

احسن امام احسن
سچیوالیہ مارگ۔بھوبنشور

شبنمی لہجے کا شاعر۔شکیل دسنوی

غزل ہر عہد میں، ہر جگہ، ہر علاقے میں اپنی مقبولیت کا ڈنکا بجاتی رہی ہے۔ ہر ذی شعور کو سوچنے پر مجبور کیا ہے، اہلِ ذوق کو لطف اندوز کیا ہے، اہلِ حکومت کو خبردار کیا ہے، معشوق کے دل کو گدگدایا ہے، قاری کو لذت سے سرشار کیا ہے، ذہنی سکون سے ہمکنار کیا ہے اور محبت کے پیغام کو پھیلایا اور عام کیا ہے۔ اس محبت کو پھیلانے اور عام کرنے والے مشہور و معروف شاعر کا نام سید شکیل دسنوی ہے۔

ادب کے منظر نامے پر سید شکیل دسنوی کا نام نیا نہیں ہے۔ وہ ایک لمبی مدت سے شعروادب کی خدمت میں منہمک ہیں۔ اردو کی خدمت میں اپنے خاندان کی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔ اردو کی خدمت کرنے کا جذبہ انھیں وراثت میں ملا۔ جسے انھوں نے اپنی اگلی نسل کو سونپ دیا۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کے والد محترم سید منظر حسن دسنوی کی یادیں ان کے چاہنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور اہلِ ذوق کے ذہن میں ان کا کلام محفوظ رہے گا۔ ان کے بھائی سید نفیس دسنوی مشاعرہ لوٹنے والے شاعر ہیں۔ اور فی الحال تواتر سے رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔ اب شکیل صاحب کے صاحب زادے سید آصف دسنوی کے قدم بھی ادب کے سبزہ زار کی طرف تیزی سے گامزن ہیں اور چھپنے چھپانے کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ پیڑھی در پیڑھی شعری روایت کا جاری رہنا آج کل کم دیکھا جاتا ہے۔

شکیل دسنوی نے جو کچھ اپنے والد محترم سے سیکھا وہ اسے آگے بڑھانے میں کوشاں رہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو نکھارنے اور سنوارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کی غزل کے بیشتر اشعار مٹھاس سے بھرپور ہوتے ہیں جس کی چاشنی قاری محسوس کرتا ہے۔ ان کے کلام میں نغمگی کی ایک وجہ موسیقی ریز بحروں کا عمدہ انتخاب ہے۔ ان کی غزلوں میں خوشی، غم، درد، کسک، نغمگی، خلوص جو روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ ہے ان سب کا استعمال وہ بخوبی کرتے ہیں۔ آپ شکیل دسنوی کے اشعار میں اپنے دل کی دھڑکن محسوس کریں گے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

اتنا بھی دو نہ غم کہ اٹھایا نہ جا سکے۔ تم کو کسی طرح سے بھلایا نہ جا سکے

وہ زخم جسے تو نے بڑے پیار سے بخشا   وہ زخم تو سینے سے لگانے کے لیے ہے

اب کے بچھڑے تو نہ جانے پھر کہاں مل پائیں گے۔ خواب بن کر چشم تر میں یہ سماں رہ جایے گا

ان کے اشعار پڑھنے کے بعد قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ یہ میرے دل کی آواز ہے۔ علیم صبا نویدی کا خیال ہے۔ ''سوچوں کا کرب ہی شاعری کے فن کو نئے زاویوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کرب میں جتنی شدت ہوگی اتنی ہی نئی راہیں، نئی منزلیں فن کار کی سوچوں کا پیش خیمہ ہوں گی۔''

اس بات پر شکیل دسنوی کی شاعری پوری طرح کھری اترتی ہے۔ وہ فکر کو وسعت دینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ حسن اور عشق کی آمیزش کا منفرد لب و لہجہ ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ انھوں نے غزل کے لغوی معنوں کو نہیں بدلا، حسن وعشق کے رموز و نکات سے غزل کو مزین کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شناخت محبت کے پیامبر کے روپ میں ہوتی ہے، جس کی بنا پر ہم شکیل دسنوی کو محبت کا شاعر قرار دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے شکیل دسنوی کے متعلق لکھا ہے۔

''شکیل کے یہاں وارداتِ حسن وعشق کی جمالیات بڑے نکھار کے ساتھ آئی ہے۔ عام جذبات کو فوقیت نہیں دی ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری میں روایتی غزل کے اشعار کی گونج اپنے انفرادی اظہار کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے جو اسلوب اور فکر کے انداز سے عشقیہ غزل کی توسیع ہیں۔''

الفاظ کا استعمال اتنے اچھے انداز میں شکیل دسنوی کرتے ہیں کہ عشقیہ شاعری کے الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں کہ اگر مجھے استعمال کر لیں تو میری قسمت چمک جائے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ شکیل دسنوی نے صرف عشقیہ شاعری کی ہے بلکہ عصری تقاضوں کو بھی پورا کیا ہے اور اپنے معیار کو برقرار رکھا ہے۔ اس کا اعتراف عشرت ظفر نے بھی کیا ہے۔

''شکیل دسنوی کی غزل بنیادی طور پر رومان پرست سہی لیکن وہ عہد کے کروٹوں اور اقدار سے نا آشنا نہیں ہے''۔

دانشورانِ ادب نے اس کا اقرار کیا ہے، شمیم طارق صاحب کہتے ہیں۔

''خوشی کی بات ہے کہ سید شکیل دسنوی نے اس عہد سے اپنی مکمل وابستگی کے باوجود اپنے دامن دل کو یاس کے کانٹوں سے الجھنے نہیں دیا ہے۔ یہی سچی اور اچھی شاعری کا اصل معیار ہے اور اس معیار پر وہ بڑی حد تک کھرے اترتے ہیں۔ شکیل دسنوی کے

(بقیہ صفحہ 30 پر)

محبّ الرحمٰن وفا
Yerwada.Amravati(M.S)

شکیل دسنوی کی شخصیت اور فن پر ایک تاثر

کسی نے کیا خوب کہا ہے ''اچھی شاعری وہی کر سکتا ہے جو ایک اچھا انسان ہو'' یہ قول محترم سید شکیل دسنوی صاحب کی شخصیت پر سو فیصد صادق آتا ہے۔ اردو شعر وادب سے والہانہ محبت کرنے والے اس قلم کار کے صحن گلشن پر خدائے بزرگ تر نے مخصوص عطاؤں، کرم اور نوازشوں کی بارشیں بڑی ہی فیاضی سے کی ہیں۔ شرافت ونجابت، شائستگی و متانت، اعلیٰ تعلیم، شعری وادبی ذوق، غیر معمولی ذہانت، اعلیٰ عہدہ، ثروت اور عزت، قدر ومنزلت، وسعتِ قلب ونظر غرض وہ کون سی نعمت ہے جو خدائے پاک نے انھیں عطا نہ کی ہو۔ پروفیسر سید منظر حسن دسنوی (مرحوم) جیسی عظیم شخصیت کے فرزند ارجمند اور محترم سید نفیس دسنوی جیسے خوش فکر شاعر کے بڑے بھائی ہونے کا انھیں شرف حاصل ہے۔ ان کی ولادت ۲ رفروری ۱۹۴۱ء کو بہار شریف کے مردم خیز قصبہ دسنہ میں ہوئی۔ ان کے نام کے ساتھ چسپاں دسنوی کا لاحقہ اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ انھیں اپنے آبائی وطن سے بڑی عقیدت اور محبت ہے۔ بی ایس سی (آنرز) بی ایس سی (انجینئرنگ) اور ایم اے (پی ایچ) جیسی اعلیٰ وارفع سندوں کے زیورات سے آراستہ ہیں۔ اعلیٰ عہدے پر فائز رہ چکے ہیں مگر پھر بھی شکیل ایک انتہائی مخلص، منکسر المزاج، سادہ لوح اور دردمند دل رکھنے والی شخصیت کا نام ہے۔ ان کے کچھ دوہے ملاحظہ فرمائیے۔

دنیا میں کس کام کے یہ دھنوان بخیل۔ چھاؤں دے کیسے تاڑ کا اونچا پیڑ شکیل
ہم نے کاٹا عمر کا یہ کیسا بنواس۔ یہ رامائن کون لکھے ہیں کہاں ہیں تلسی داس

سید شکیل دسنوی صاحب پبلک ہیلتھ ڈپارٹمنٹ (اڑیسہ) میں سپرنٹنڈنگ انجینئر کے عہدے سے 1999 میں وظیفہ یاب ہوئے ہیں۔ زلفِ عروس فن کی چھاؤں میں پناہ لئے ہوئے اور انھیں سجاتے سنوارتے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر آج بھی شکیل صاحب کا قلم توانا اور عزائم بلند ہیں۔ مختلف ملکی اور بین الاقوامی سطح کے معیاری رسائل وجرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہو کر ان کے فن کا لوہا منواتی رہی ہیں۔ اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ ''زندگی اے زندگی'' 1981 ''تنہا تنہا'' 1989 ''کتنی حقیقت کتنا خواب'' 2005 اور دل نا آشنا'' 2006 میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان خوبصورت اور معیاری شعری مجموعوں سے سید شکیل دسنوی صاحب نے اردو شعر وادب کے گراں قدر اثاثے میں مزید اضافہ کیا ہے۔

وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ یوں تو دوہے، نظم اور گیت بھی خوب کہتے ہیں مگر صنف غزل جسے پروفیسر رشید صدیقی صاحب نے ''اردو شاعری کی آبرو'' گردانا ہے اسی خوبصورت صنفِ سخن نے شکیل دسنوی کی منفرد شناخت بنائی ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کے زرّیں صفحات پر بہترین اشعار جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کی مرصّع غزلیں فنی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے منفرد مخصوص، شگفتہ پُرکشش لہجے میں کہیں کلاسیکیت اور رومانیت کے حسین ودلکش نقش ونگار ملتے ہیں تو کہیں عصری حسیت کے نشیب وفراز۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی حسین آمیزش ان کی ردائے اسلوب کی سلوٹوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ ان کے فن کے خزانے سے چن کر چند لعل و گہر بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں جنھیں پڑھ کر قارئین یقیناً محظوظ ہوں گے۔

ہم سلگتے رہ گئے تنہائیوں کے آنچ میں۔ آرزوؤں کی قبا آخر جلی برسات میں
شہر دل کی گلیوں میں اب تو خاک اڑتی ہے۔ دستکیں ہر اک دل پر دے رہا ہے غم تنہا
یہ زندگی ہے کھیل کوئی دھوپ چھاؤں کا۔ روشن رخ حیات ابھی ہے ابھی نہیں
لکھتے تھے اپنا نام ترے نام کے قریب۔ کچھ لطف ہی عجیب سا رسوائیوں میں تھا

شکیل صاحب نے اپنے اشعار میں ہندی الفاظ ساجن، گوری، سکھیاں، گاؤں، پنگھٹ، چوپال، میت، پریت، ساون، پروائی، نین، مکھڑا، روپ، درپن، وغیرہ کو اس قدر شگفتہ اور پرکشش ترتیب وانداز سے برتتے ہیں کہ ان کے اشعار کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ چند اشعار دیکھیں۔

چاند پہ چھایا ہلکا ہلکا بادل اچھا لگتا ہے۔ تیرے سندر مکھڑے پر یہ آنچل اچھا لگتا ہے
چاند سا چہرہ، روپ سنہرا، جسم لچکتا ڈالی سا۔ اک دن دیکھا سندر سپنا داتا کا اپہار لگے
ہنسی کے سینے میں کتنے چھید ہوئے تو سُر نکلے کتنا کٹھن ہے شعر کا کہنا سمجھے خاک زمانہ ہوا
تن من سلگے جی گھبرائے برسیں یہ کجرارے نین۔ کون ستائے چھپ چھپ کر یوں یادوں کی پروائی میں

اس گنگا جمنی زبان کو شکیل دسنوی سبک اردو سے موسوم کرتے ہیں۔ شکیل نہ صرف کلاسیکیت اور رومانیت بلکہ تصوف کے رنگ میں بھی خوب اشعار کہتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیں۔

جو ہو رسائی تری ذات تک تو کیسے ہو۔ مرے وجود پہ خاکی لباس رہتا ہے
توڑ کے سارے رشتے ناطے جب بھی حرم کی اور چلے

راہ میں خود ہی آجاتا ہے سید جی بت خانہ ایک

شکیل اپنے سینے میں حساس اور درد مند دل رکھتے ہیں جو انھیں حصار ذات میں قید نہیں ہونے دیتا۔ زیست کے جلتے سلگتے موضوعات' عصری حسیت اور سوزِ غم دوراں سے بے قرار ہو کر شکیل صاحب کا قلم یوں گویا ہوتا ہے۔

یزید وقت کے نخوت کا ہاتھ کیسا ہے۔ سمجھ کے جامِ شکستہ اچھالتا ہے مجھے
تشنہ لبی کے دشت میں پہنچا شکیلؔ جب۔ دریا بڑھا تھا خود مری جانب سراب کا
لہو زنجیر بن جائے گا اک دن آستینوں کا۔ زباں بن جائے گا خونِ غِ عصیاں ہم نہ کہتے تھے
یہ طوفاں جبر و استبداد کی بنیاد ڈھائے گا۔ چھلک جائے گا جب خونِ شہیداں ہم نہ کہتے تھے
چیختی ہیں وحشتیں ساری فضا سہمی ہوئی۔ کیا ہوا کیوں زیست کی ہے ہر ادا سہمی ہوئی
اس قدر تاریک شب دیکھی نہ تھی پہلے کبھی۔ ہے فلک پر چاند تاروں کی ضیاء سہمی ہوئی
کیوں چمن اوڑھے ہوئے ہے آج شعلوں کی ردا۔ بھاگتی ہے آبلہ پا کیوں صبا سہمی ہوئی
موت کے خونخوار پنجوں میں سسکتی ہے حیات۔ آج ہے انسانیت کی ہر ادا سہمی ہوئی

غمِ حیات اور سوزِ غم دوراں کی دھوپ کی شدت اور تمازتوں سے پریشان ہو کر شکیل صاحب کا دل زلفِ عروسِ فن کی چھاؤں میں پناہ گزیں ہو کر یوں گویا ہوتا ہے۔

زلفِ عروس فن کی ملی چھاؤں میں پناہ۔ جب بھی غمِ حیات کی شدت بڑھی شکیل

اور جب زندگی کی تنویر انھیں ملتی ہے تو اس وقت خود ان کی تصویر دھندلا چکی ہوتی ہے اور شاعر گویا ہوتا ہے۔

کس موڑ پر ملی ہے تنویر زندگی کی۔ دھندلا گئی ہے خود جب تصویر زندگی کی

اتنی بہترین غزل گوئی پر محترم شکیلؔ دسنوی صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے خدائے پاک کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ رو بہ صحت رہیں اور ان کا ادب نواز قلم سدا یوں ہی علم و فن کے بیش بہا موتی بکھیر تا رہے (آمین) ☆☆☆

(سید شکیل دسنوی کی دوہا نگاری کا بقیہ)

دکھ سکھ رس :

کون مسافر کر سکا منزل کا دیدار۔ پلک جھپکتے کھو گیے راہوں کے آثار (مخمور سعیدی)
تلوے نیچے دن کٹے اور آنکھوں میں رات۔ سید جی مت پوچھئے کیسے ہیں حالات
پلکوں پلکوں چھاؤں ہے رخ پر کیسی دھوپ۔ رہ جائے من مار کے دیکھے جو یہ روپ
(شکیل دسنوی)

پریم رس :

اس سے بڑھ کر کون ہے دنیا میں سوغات
پیت اک ایسا پھول ہے مہکے جو دن رات (نادم بلخی)
کاگا اب دے جائے ہے یہ ڈھارس ہر بار۔ ساجن اک دن آئیں گے بن چٹھی بن تار
تجھ سے ملن کی آس میں ہر پل یگ سمان۔ تکتے تکتے راہ سجن تیر بھیا کمان
(شکیل دسنوی)

ایکتا رس :

دفنائیں تو خاک ہوا گنی دیں تو راکھ
اس ماٹی کے روپ کی بس اتنی ہی ساکھ (نادم بلخی)
جب سے پہنا جسم کا خاکی ایک لباس
ہم تو اپنے آپ کی بھول گئے بو باس
دنیا میں کس کام کے یہ دھنوان بخیل
چھاؤں دے کیسے تاڑ کا اونچا پیڑ شکیل (شکیل دسنوی)
الجھی گتھی زیست کی اور ملے نہ چھور
تھامے رہیے سانس کی کچی سی یہ ڈور (نادم بلخی)

اپدیش رس :

جیون بھر کرتا رہا جو دولت کی بات
آیا خالی ہاتھ ہی گیا بھی خالی ہات (نادم بلخی)
ہستی ہے اک خواب کیا اس سے موہ شکیل
پانی میں اک عکس سی ہو جائے تحلیل
سکھ کے پیچھے بھاگئے کبھی نہ آئے ہاتھ
دکھ ہی سچا میت ہے سدا نبھائے ساتھ (شکیل دسنوی)

چرتر رس :

جیون بھر سنسار میں کرے جو اچھے کام
مر جانے کے بعد بھی رہے اسی کا نام (نادم بلخی)
اس جمہوری دور میں دیکھا عجب رواج
سر پر اک غریب کے کانٹوں کا تھا تاج
سید جی آدرش کیا کیا سچ کا پرچار
کل جگ کے بازار میں بک جائیں اوتار (شکیل دسنوی)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سید شکیل دسنوی کے دوہوں میں ساتوں رنگ قوس قزح کی طرح نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ نئے موضوعات کی طرف بھی ان کا رہوارِ سخن سرگرم سفر ہے۔ اسی طرح کی خوبیاں ان کے دوہا گیت' دوہا غزل اور دوہا نظموں میں رقص کناں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی تحقیق کی جائے اور ان کی دیگر خوبیوں کو منظرِ عام پر لایا جائے :

سیّد سب کے بھاگ ہیں بکھرے بکھرے خواب۔ کھو کر ان کو اور کچھ جینا لگے عذاب
سیّد جی مت بویئے کھٹّے میٹھے خواب۔ آنکھوں میں آجائے گا اشکوں کا سیلاب
سر پہ کوی مہان کے دوہوں کا تھا تاج۔ کل جگ میں پر آ گئے یہ دوہا نٹراج

حواشی: اردو شاعری میں نئے تجربے (علیم صبا نویدی)' نقد و نوا (ڈاکٹر آفاق فاخری)' کاروانِ ادب (دسمبر ۲۰۱۲ء)' دنیا مایا جال (سراج دہلوی) ☆☆☆

ارشد قمر
ڈالٹن گنج، پلاموں (جھارکھنڈ)

سید شکیل دسنوی کی غزل گوئی

بہار کے نقشے پر دسنہ ایک ایسا مردم خیز خطہ ہے جسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جہاں سے کئی نابغۂ روزگار اور بلند پایہ شخصیتیں عالمِ وجود میں آئیں اور کارہائے نمایاں انجام دیں۔ جن میں سید سلیمان ندوی، ابوظفر ندوی، نجیب اشرف ندوی، سید صباح الدین، عبدالقوی دسنوی اور سید منظر حسن دسنوی وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شکیل دسنوی کا تعلق بھی اسی خطے سے ہے جن کی پیدائش ۲۰ رفروری ۱۹۴۱ء کو ہوئی۔ اُن کے والد سید منظر حسن دسنوی نے دسنہ سے ہجرت کر کے اڑیسہ کے شہر کٹک کو اپنا وطنِ ثانی بنایا۔ ان کے والد خود ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ شکیل صاحب کو شعری ذوق ورثے میں ملا۔ پیشے سے انجینئر ہونے کے باوجود نہ صرف شعری ذوق رکھتے تھے بلکہ ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔

ان کے تین شعری مجموعے زندگی اے زندگی ۱۹۸۱ء میں، تنہا تنہا ۱۹۸۹ء میں اور کتنی حقیقت کتنا خواب ۲۰۰۵ء میں منصۂ شہود پر آ کر اہلِ نظر سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

یوں تو شکیل دسنوی نے غزلوں کے ساتھ دوہے اور گیت پر بھی طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی شہرت بحیثیت غزل گو کی ہے۔ بقول علی احمد جلیل:

''آپ نے غزل کو غزل کے روپ میں برتا ہے اور تغزل کی روایت کو برقرار رکھا ہے''۔

اک نور سا لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو۔ ساغر میں اتر آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
تنہائی کے عالم میں کوئی شوخ سا جھونکا۔ چھو کر جو نکل جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

محبوب نور بن کر ہمیشہ حواس پر لہراتا نظر آتا ہے اور ساغر میں اس کی شکل نظر آتی ہے۔ شوخ ہوا تنہائی میں چھو کر جب نکلتی ہے تو محبوب کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔

شکیل دسنوی کی غزلوں میں احساسِ غم کچھ اس انداز میں قاری کے دلوں میں اُترتا ہے کہ اس کی دھیمی دھیمی آنچ دلوں میں حرارت اور توانائی پیدا کر دیتی ہے۔ ان کی شاعری فکر، مواد اور اسلوب میں ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے۔ ان کے کلام میں جذبہ اور احساس کی شدت ہے۔ ان کی شعری روایت میں ماضی کا احساس ہے۔ ان کی غزلوں میں نئی قدروں کے التزام کے ساتھ روایت کی پاسداری بھی ہے۔ ان کی غزلوں کا لب و لہجہ متانت اور شیرینی لیے ہوئے ہے۔ جن میں روانی اور سلاست دونوں موجود ہیں۔ شکیل دسنوی غزل کے سچے عاشق ہیں ۔

اس موڑ پر ملی ہے تو یر زندگی کی ۔ دھندلا گئی ہے خود جب تصویر زندگی کی
کیا پوچھتے ہو مجھ سے تصویر زندگی کی ۔ اشکوں سے مٹ گئی ہے تحریر زندگی کی

زندگی کو روشنی اس وقت ملی جب اپنی زندگی کی پہچان دکھائی دینے لگی۔ زندگی کی حقیقت بھری کہانی کو اشکوں یعنی غم نے مٹا ڈالا۔ شباب للت رقمطراز ہیں:

''محبت کا ازلی و ابدی جذبہ، حسن و عشق کے راز و نیاز اور ناکامیِ عشق کے چہرے شکیل کی غزلیہ شاعری کا ایک نمایاں عنصر ہیں''۔

شکیل دسنوی کے یہاں حسن و عشق کی جمالیات اپنے نکھار کے ساتھ منفرد تخیل اور انفرادی اظہار کے پیرایے میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری بدلے ہوئے وقت و حالات کی بہترین عکاس ہے۔ انھوں نے جابجا اس کا تجربہ بھی کیا ہے۔ انسانی زندگی میں ہونے والے واقعات و حادثات کو شدت سے محسوس کیا ہے اور انھیں شعری جامہ عطا کیا ہے۔ انھوں نے جدیدیت اور جدّت پسندی کو بے وجہ فروغ نہیں دیا۔ ان کی شاعری گھن گرج سے پاک ہے۔ انھیں کلاسیکی شاعری سے خاصا لگاؤ ہے۔ جب جدت اور روایت ہم آمیز ہوتے ہیں تو شعریت عروج کی طرف دکھائی دیتی ہے۔ بسا اوقات انسان کو زندگی ایک قرض معلوم ہوتی ہے۔ جو سانس کی شکل میں قسطوں میں ادا کرتا رہتا ہے۔

ایک بے وفا کے دل میں ہے تصویر آج بھی
آنکھوں میں آنسوؤں کی ہے تحریر آج بھی
دیکھا تھا جاگتی ہوئی آنکھوں سے ایک خواب
اُس خواب کی عزیز ہے تعبیر آج بھی

بقول اعجاز علی ارشد:

''شکیل کا فن ارتقائی راہ پر گامزن ہے انہوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں رکھی ہیں۔ بلکہ ان کو شاعری کا موضوع بناتے رہے ہیں۔ یہی ان کے کلام کی تازگی، احساس کا سبب ہے۔ انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔''

بلاشبہ ان کی اس بات کی تصدیق شکیل صاحب کی غزلوں کے

مطالعے سے ہو جاتی ہے۔

عمر بھر ناکامیوں کے دل پہ یوں نشتر چلے
زندگی کی آرزو میں ہم تو آخر مر چلے
کیا قیامت کی گھڑی تھی جانتا ہے دل ہی کچھ
شب نے جب آنچل سمیٹا اور تم اُٹھ کر چلے

محبوب سے ملنا ہی آرزو کا پورا ہونا لگتا ہے۔ بڑے نازک انداز سے شکیل صاحب نے قیامت کی گھڑی میں محبوب کا پاس سے اٹھ جانا کہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شعر کے فن کی گہرائیوں کو شکیل نے پالیا ہے۔ کامیاب شاعر وہ ہے جس کا کہنے کا انداز اور فکر کی گہرائی خوبصورت ہو۔ اس بات کو شکیل دسنوی بخوبی جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں نئی اقدار کی صحیح ترجمان ہیں۔ ان کی غزلوں میں ندرتِ خیال بھی ہے تغزلانہ رنگ بھی۔ دوسری صفت یہ بھی ہے کہ ان کی غزلوں میں بھرپور غنائیت بھی موجود ہے۔ اُن کی بیشتر غزلیں مترنم بحر میں ہیں۔ ان کی غزلوں کا خاص وصف یہ بھی ہے کہ ان کے اندازِ بیان میں سادگی اور برجستگی کے ساتھ شگفتگی اور پُرکاری پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں کائنات کے بدلتے رنگوں اور انسانی طبیعت پر ہونے والے اثرات اور تغیر کو بھی جگہ دی ہے۔ انھیں بیان و زبان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کا مشاہدہ اور مطالعہ بڑا عمیق ہے:

اس خارِ زارِ غم سے گزرنا محال تھا　　تلوے لہولہان تھے دل بھی نڈھال تھا
مجھ کو چڑھا کے خوش ہوئے شک کی صلیب پر　　سُنتے ہیں اس کا بعد میں سب کو ملال تھا

ظلم کرنے یا ہونے کے بعد اس کا اکثر چرچا ہوتا ہے اور پھر مظلوم سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ خارِ زارِ غم بہت مشکل گزرگاہ ہے مگر جو گزرتا ہے وہ اپنے کاندھے پر اپنی صلیب لیے گزرتا ہے جس کا انجام موت کے سوا اور کیا ہوگا۔ دنیا کا یہ دستور ہر جگہ رائج ہے۔

زحمتیں جینے کی دن رات اٹھاتے کیوں ہو　　خود کو ہر لمحہ صلیبوں پہ چڑھاتے کیوں ہو
دلِ افسردہ کو اب اور دُکھاتے کیوں ہو　　جب نہیں ربط تو پھر یاد بھی آتے کیوں ہو

ایک شاعر کے جذبات اور احساسات عموماً عام لوگوں کے مقابلے کہیں زیادہ لطیف اور نازک ہوتے ہیں۔ وہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات سے حد درجہ متاثر بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے احساسات شعر بن کر صفحۂ قرطاس پر بکھرنے لگتے ہیں۔ شکیل صاحب بھی حسّاس طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی اس کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جو غزل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

چیختی ہیں وحشتیں ساری فضا سہمی ہوئی۔ کیا ہوا کیوں زیست کی ہے ہر ادا سہمی ہوئی
کیوں چمن اُوڑھے ہوئے ہے آج شعلوں کی ردا۔ بھاگتی ہے آبلہ پا کیوں صبا سہمی ہوئی
موت کے خونخوار پنجوں میں سسکتی ہے حیات۔ آج ہے انسانیت کی ہر ادا سہمی ہوئی

ان کی غزلوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے احساسات، جذبات و تجربات کے اظہار کے لئے عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ اخیر میں حبیب خاں کے اس قول پر اپنی بات ختم کر چاہوں گا۔ ''انھوں نے جس طرح زندگی کو برتا اور سمجھا ہے اس کو شعر کی صورت میں پیش کرنے کی پرخلوص کوشش کی ہے ان کی غزلوں میں عشقیہ واردات کی ایسی کسک محسوس ہوتی ہے جو ہمیں میرؔ کی یاد تازہ کراتی ہے۔

بے چہرگی کا کرب ہے اپنی تلاش میں
اور دل کے آئینے پہ غموں کی خراش ہے

بلاشبہہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکیل دسنوی کی غزلوں میں جو احساس کی شدت اور جاذبیت کا عنصر موجود ہے وہی انھیں عصر حاضر کا کامیاب اور مقبول شاعر بناتا ہے۔

☆☆☆

(شبنمی لہجے کا شاعر کا بقیہ)

چند خوبصورت اشعار دیکھیے

کتنے شکستہ ارمانوں کا　　چلتا پھرتا سایا ہوں میں
دم بھر کو آ کے بیٹھے زلفوں کی چھاؤں میں گر۔ کیوں گردشِ زمانہ ہر سمت ڈھونڈتی ہے
آنکھوں میں میری چھوڑ دو خوشیوں کی اک کرن۔ باقی یہ سارا شوقِ تماشا خرید لو
خشک ہوتے رہے آنکھوں میں سمندر کتنے۔ اور خموشی سے ہوئے ہونٹ یہ پتھر کتنے

شکیل دسنوی کی خوبی یہ ہے کہ معمولی سے خیال کو اتنی وسعت عطا کرتے ہیں کہ قاری ذہن میں اک مکمل خاکہ تیار کر لیتا ہے اور اس کا ذہن وادیِ فکر میں اڑان بھرنے لگتا ہے۔ اور وہ شکیل صاحب کی شاعری سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ خیال کی ندرت، تخیل کی اڑان فکری غوطہ زنی، شگفتہ ادائیگی، مشاہدات اور تجربات کا سنگم، احساسات کو کاغذ پر انڈیلنا، جذبات کو قاری کے دل تک پہونچانا' یہ کام شکیل صاحب خوب اچھی طرح کرتے ہیں۔ سادہ اور سلیس زبان میں شعر کو پُر اثر بنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب علی فرماتے ہیں:

''اصل میں شکیل دسنوی کا بنیادی رنگ و آہنگ اور ان کی شاعری کا ماحصل ان کے مزاج کی میانہ روی ہے۔ غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں وہ اپنا توازن نہیں کھوتے اور نہ اپنے تخئیل کو بے لگام چھوڑتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات و خیالات کو سیدھے سادے اشعار اور بول چال کی صاف ستھری زبان میں ظاہر کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں فکر و اظہار کی گہرائی بھی ہے اور جذبات کا فنکارانہ اظہار بھی''۔

زندگی اے زندگی' تنہا تنہا' کتنی حقیقت کتنا خواب' دلِ ناآشنا ان مجموعوں کے مطالعے سے شکیل دسنوی کی شاعری ان کی شخصیت اور معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں اپنی بات ان کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔

خورشید ناامیدی پیغام ہے فنا کا۔ ہر آرزو کا پیکر جیسے کہ شبنمی ہے

☆☆☆

منظومِ خراجِ عقیدت

علیم صبا نویدی
امیر النساء بیگم اسٹریٹ، چینئی

منظوم خراجِ عقیدت
حضرت سید شکیل دسنوی مرحوم کے نام
ایک سانیٹ

حضرت شکیل اصل میں مینارِ سر بلند
روحِ ادب' وقارِ ادب اور ادب نواز
ہر صنف شاعری میں دخیل اور سر فراز
اتنی بلندیوں پہ پہنچ پایے صرف چند

وہ کاروانِ شعر و ادب کے تھے سربراہ
تخیّل ان کی ہر حدِ آفاق چھو کے آئے
پر اپنے کھول کھول کے افکار نو بچھایے
سورج ہوا طلوع جدھر بھی اُٹھی نگاہ

ان کے خلوص و مہر کا گرویدہ ہر کوئی
ان کے شعور فکر کی شہرت بھی بے پناہ
ان کے لیے دلوں میں محبت تھی بے پناہ
سوئے کٹک نگاہِ دو عالم جمی ہوئی

صدیوں میں اک شکیل سا فنکار آیے گا
روشن نصیب نقشِ قدم چھوڑ جایے گا

منیر سیفی
Samanpura. BVC Patna-800014

قطعۂ تاریخ رحلت
بر وفات سید شکیل دسنوی

لگ کر گلے ہواؤں سے روتی ہیں خوشبوئیں
اہل چمن تمام گریبان چاک شد
''نازل منیر مصرعِ تاریخ اب ہوا''
2014
سید شکیل دسنوی پیوندِ خاک شد

سعید رحمانی

علم و ہنر کے نور کا مینار تھے شکیل

ملکِ ادب کے قافلہ سالار تھے شکیل
نقد و ادب میں ان کے بصیرت کا تھا جمال
خوشبو بکھیرتے تھے وہ اپنے کلام سے
شائستگی بھی ان کی بڑی دلنواز تھی
زینت انھیں سے محفلِ شعر و سخن کی تھی
تھے دوستوں کے واسطے وہ پھول کی مثال
کی سرپرستی اس طرح ''ادبی محاذ'' کی

علم و ہنر کے نور کا مینار تھے شکیل
شعر و ادب کے حسن کا معیار تھے شکیل
گویا کہ اپنی ذات میں گلزار تھے شکیل
اپنوں کے اور غیروں کے بھی یار تھے شکیل
اردو زباں کے اک درِ شہوار تھے شکیل
اور دشمنوں کے واسطے تلوار تھے شکیل
اس کی بلندیوں کے بھی معمار تھے شکیل

نقد و ادب میں اور صحافت میں اے سعیدؔ
اک انفرادی شان کے فنکار تھے شکیل

سید شکیل دسنوی کی تخلیقی کائنات

غزلیات

ہم تو سیّدؔ، یہاں کے تھے ہی نہیں
"دھوپ تھے، سائباں کے تھے ہی نہیں"
خود کفِ پا نے رہنمائی کی
ہم کسی کارواں کے تھے ہی نہیں
توڑ بیٹھے ہیں پیاس سے رشتہ
ہم فراتِ رواں کے تھے ہی نہیں
زندگی نے تو ہم کو اپنایا ہم مگر
اس جہاں کے تھے ہی نہیں
ہم سے وحشی ہوا کا کیا قصہ
ہم کسی بادباں کے تھے ہی نہیں
یوں ہوئے ہیں زمیں نشیں جیسے
ہم کبھی آسماں کے تھے ہی نہیں

☆

ایک محبوب سب سے جدا چاہیے
ذوقِ سجدہ کو کوئی خدا چاہیے
تیرے کاسے میں کیا ہے؟ یہ پہلے بتا
زندگی پھر بتا مجھ سے کیا چاہیے
تو بہت دل رُبا ہے حسیں ہے مگر
کوئی لیلیٰ صفت ایک ادا چاہیے
تیری تصویر ویسے ہے دلکش بہت
اس میں تھوڑا سا رنگِ وفا چاہیے
موت سیّدؔ نبھا لے گی رسمِ وفا
زندگی سا کوئی بے وفا چاہیے

دل تو ہے بس ایک کھلونا' کیا سمجھے
توڑ نہ دینا خواب سلونا' کیا سمجھے
عشق کروگے تب یہ سلیقہ آئے گا
پلکوں پہ اشکوں کو پرونا' کیا سمجھے
جی لیتے ہیں اسی سہارے کتنے لوگ
کھونا سب کچھ، خواب نہ کھونا' کیا سمجھے
کر کے کبھی اقرار وہ اپنی الفت کا
کب ممکن ہے ایسا ہونا' کیا سمجھے
کتنے گہرے داغ لگے محرومی کے
کھیل نہیں اشکوں سے دھونا' کیا سمجھے
توڑ دیا ہے دل کو ظالم دنیا نے
اس کا اک اک بات پہ رونا' کیا سمجھے

☆

الجھے الجھے سے عجب خواب لیے پھرتے ہیں
لوگ اب ذہن میں تیزاب لیے پھرتے ہیں
اُن سے ملئے تو ذرا سوچ سمجھ کر ملئے
بُغض کچھ دل پہ یہ احباب لیے پھرتے ہیں
عشق کی اہلِ جنوں سے روایت زندہ
ٹوٹ جاتے ہیں، مگر خواب لیے پھرتے ہیں
ساتھ چلتی رہی کردار کی عُریانی بھی
لوگ جو جسم میں کمخواب لیے پھرتے ہیں
دیدۂ نم میں جو کچھ خواب لیے پھرتے ہیں
عشق والے دلِ بیتاب لیے پھرتے ہیں

دوہے

کس پر اتنا کرے گھمنڈ، کتنا ہے لاچار
ماٹی تیرا انت ہے، ماٹی کے اوتار

☆

پوچھ ذرا یم دوت سے، اے میرے معبود
سانسوں کا سب قرض چکا کا ہے کا اب سود

☆

باتی سی سب جل بجھی، جلا جلا کے دیپ
کیسا ملگج ہو گیا، تیرا روپ سروپ

☆

سب کچھ آخر لے اُڑی، سمے کی بیرن دھوپ
تجھ سے ملن کی آس میں، ہر پل یُگ سمان

☆

تکتے تکتے راہ سجن، تیر بھیا کمان
لاج ہرن کے کھیل میں، خود ہی کھائے مات

☆

لاج ہرن کے کھیل میں، خود ہی کھائے مات
کورے تن کو جب چھوئیں، ان دیکھے دو ہات

☆

سر پہ کبت سمراٹ کے، دوہوں کا تاج
جنمے کل جگ کال میں، دوہوں کے نٹراج

سید شکیل دسنوی کی غیر مطبوعہ تخلیقات

سلام

کملی والے پہ لاکھوں درود و سلام
السلام، السلام، السلام، السلام

سب سے محبوب سب سے وہ پیارا لگے
جیسے خالق کی آنکھوں کا تارا لگے
اور تقدس میں قرآں کا پارہ لگے

عرشِ اعظم پہ تحریر کس کا ہے نام
کملیؐ والے پہ لاکھوں درود و سلام

سرخرو کس کے دم سے عبادت ہوئی
کس کی نبیوں میں قائم امامت ہوئی
کس کو نورِ ازل کی زیارت ہوئی

روحِ کل سے کیا تھا وہ کس نے کلام
کملیؐ والے پہ لاکھوں درود و سلام

اک اشارے پہ شق اُلقمر ہوگیا
اور سورج اِدھر سے اُدھر ہوگیا
جو نہ ہونا تھا ممکن، مگر ہوگیا

سب سے اعلیٰ ہے عالم میں کس کا مقام
کملیؐ والے پہ لاکھوں درود و سلام

اہلِ ایماں کو سیّدؔ کہاں ہے کلام
آیتوں سے ہے واضح خدا کا کلام
حکمِ ربی ہے، بھیجو درود و سلام

کملیؐ والے پہ لاکھوں درود و سلام

☆☆☆

منقبت

کربلا کے شہیدوں کو لاکھوں سلام
اسلام، اسلام، اسلام، اسلام

حق و باطل میں جنگ یوں لڑی جائے گی
کربلا کو نہ تاریخ دُھرائے گی
اب کہاں سے حُسینؑ انا لائے گی

کربلا کو ملا ہے بقائے دوام
کربلا کے شہیدوں کو لاکھوں سلام

حق کا پرچم اٹھایا، نہ جُھکنے دیا
اپنے بڑھتے قدم کو نہ رکنے دیا
چال کوئی یزیدی نہ چلنے دیا

ہے شجاعت میں بے مثل ان کا پیام
کربلا کے شہیدوں کو لاکھوں سلام

سر کو باطل کے آگے جُھکایا نہیں
مٹ گئے پر انا کو مٹایا نہیں
راہِ حق سے قدم کو ہٹایا نہیں

سرفروشی پہ ان کے ہے کس کو کلام
کربلا کے شہیدوں کو لاکھوں سلام

برہا گیت

نین ہوئے ہیں جب سے پیار
گوندھے من سپنوں کا ہار
کیسا ملا ہے یہ اُپہار
یاد کسی کی دل تڑپائے

بیری جوانی بیتی جائے
لوٹ کے پر، من میت نہ آئے

جوڑ کسی کا نام سکھی رے
کرتی ہے بدنام سکھی رے
جانے کیا انجام سکھی رے
سوچ کے اب تو جی گھبرائے

بیری جوانی بیتی جائے
لوٹ کے پر، من میت نہ آئے

آنسوؤں سے تر آنچل ہے
دُکھ سے منوا بوجھل ہے
پریت میں کس کی پاگل ہے
دل پہ کوئی یوں چوٹ نہ کھائے

بیری جوانی بیتی جاییے
لوٹ کے پر من میت نہ آیے

کیسے اُڑوں، کہ پنکھ کٹے ہیں
دور پیا کس دیس بسے ہیں

☆☆☆

سید شکیل دسنوی کے ضرب المثل اشعار
(ترتیب۔ سید نفیس دسنوی)

پاس ہوتے تو گفتگو کرتے۔ یعنی ہر بات روبرو کرتے
کیا کرو گے شکیلؔ کو رسوا۔ خود ہی خانہ خراب ہے یارو
ضرورت آپڑے تو جنگ کا نقشہ بدل ڈالیں۔ نہ ہم خیمہ بدلتے ہیں، نہ ہم لشکر بدلتے ہیں
تیر اپنا کمان میں رکھنا۔ خوف دشمن کی جان میں رکھنا
اپنی قسمت کہ کوئی بات بنائے نہ بنی۔ چھاؤں سمٹی تری دیوار کے آتے آتے
ہو گئے یوں زمیں نشیں جیسے۔ ہم کبھی آسماں کے تھے ہی نہیں
خرد کی حدوں سے بھی آگے نکل کر۔ خدا جانے دیوانہ کیا سوچتا ہے
تو توڑتا بہت ہے سلیقے سے سارے خواب
میں خواب جوڑتا ہوں، کلاکار میں بھی ہوں
زباں چُپ ہے یہ خنجر بولتے ہیں۔ لہو آمیز منظر بولتے ہیں
عمر بھر مہمان بن کر میں یہاں شاید رہا۔ نام کی تختی مری تھی، یہ مکاں میرا نہ تھا
رشتہ رہا عجیب مرا زندگی کے ساتھ۔ چلتا ہو جیسے کوئی کسی اجنبی کے ساتھ
قسمت سے اک بازی کھیلی، پو بارہ چل پانسہ ڈال

☆☆☆

سیدؔ جی کے خسرو رنگ اشعار

یہ شبنم پھول، تارے، چاندنی میں عکس کس کا ہے؟
یہ فطرت کی حسیں جادوگری میں عکس کس کا ہے؟
یہ سید خواب سے ترشے ہوئے نازک حسیں پیکر
نقوشِ رشکِ سحرِ سامری میں عکس کس کا ہے
کال اکال سے جیون نیّا چلی ہے کس منزل کی اور
کیا جانیں ہم مورکھ پرَانی کون ہے اس کا کھیون ہار
نگری نگری گھوم کے دیکھا، سارے جگ کا ایک سا حال
دُکھ سنبھالے راج سنگھاسن، سُکھ پڑا ہے جیسے کال
کیا جانے کیوں نگری نگری، ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
دُکھ کے کالے سائے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں
بھید بھاؤ کی باتیں کیسی، جگ تو مسافر خانہ ہے
ایک ہی رستے کے سب راہی، سب کا ایک ٹھکانہ ہے
بنسی کے سینے میں کتنے چھید ہوئے تو سُر نکلے
کتنا کٹھن ہے شعر کا کہنا، سمجھے خاک زمانہ ہو
چھوٹی سی بات سہی، پر کھینچے ہے یہ طول میاں
جیون بھر کا روگ بنے ہے دو آنکھوں کی بھول میاں
روپ کی دیوی رام نہ ہوگی، چلّہ کھینچو، جوگ کرو
لاکھ لگاؤ تم آنکھوں سے ان چرنوں کی دھول میاں
موہ نہ مایا من میں لیکن، پریم سے کم اُپہار نہ لیں
کیا جانے کس دُھن میں گوری جوگی تیرے پھرتے ہیں
دیکھا یار و گہن کا منظر ہم نے اپنی باہوں میں
چاند سے مکھ پر زلف کے سائے جب لہرائے رات گئے
میری وفا وہ چیز ہے پیارے جس کا کوئی بھاؤ نہ مول
اُسے تو دل کے دامن میں لے اپنے پیار کے بدلے تول
کتنی امیدیں، کتنے سپنے پیاسے پیاسے پھرتے ہیں
جھانک کے دیکھے کاش کوئی ان آنکھوں کی گہرائی میں

☆☆☆

سید شکیلؔ دسنوی کے چند پسندیدہ اشعار۔ شکیل نوازوں کی نذر

زباں چُپ ہے، یہ منظر بولتے ہیں۔ لہو آمیز خنجر بولتے ہیں
ضرورت آپڑے تو جنگ کا نقشہ بدل ڈالیں
نہ ہم خیمہ بدلتے ہیں، نہ ہم لشکر بدلتے ہیں
تم کیسے ستمگر ہو، تہذیبِ ستم سیکھو۔ کیوں دیکھ کے چُپ سے ہو، کیوں آنکھ یہ بھر آئی
اشکوں سے نم بیاض وہ لوٹا گیا مجھے۔ میری وفا کا کیسا صلہ دے گیا مجھے
کچھ بکھری ہوئی یادیں، جینے کا بہانہ ہیں۔ کچھ خواب بہت دن تک آنکھوں میں مچلتے ہیں
وہ سراپا گلاب جیسا تھا۔ اک حقیقت تھا، خواب جیسا تھا
پڑھتا مجھے بھی کاش کہ تفصیل سے کوئی۔ چہرہ تو اقتباس تھا دل کی کتاب کا
ہم یوں ملے کہ جیسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس کے سوا تو اور کوئی راستہ نہ تھا
پھر والبِ اظہار ہے، اب دیکھیے کیا ہو۔ منصور سر دار ہے، اب دیکھیے کیا ہو
میرا کیا ہے، کسی سائے میں ٹھہر جاؤں گا۔ اجنبی بن کے ترے در سے گزر جاؤں گا

☆☆☆

ڈاکٹر محبوب راہیؔ
Barsitakli,Akola-444401

مناظر عاشق ہرگانوی کا نیا تنقیدی کارنامہ

شعروادب کے ہمہ جہت اور لامحدود میدانوں میں برق رفتار قلمکار ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی صبارفتاری کے پیشِ نظر یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس تحریر کی تکمیل تک ان کا زیرتذکرہ کارنامہ نیارہ جائے گا کہ تب تک کسی اور ایک نئے کارنامے کے عالم وجود میں آنے کے امکانات سے انکار بھی کیا نہیں جاسکتا۔ بعد ازاں اس تحریر کے برائے اشاعت ارسال کرنے تک کوئی تیسرا اور کسی رسالے میں اشاعت پذیر ہونے تک چوتھا اور پھر اس کی میری کسی کتاب میں شمولیت تک موصوف کے انبار در انبار کارنامے ان کی رفتارکاری روشنی میں منصہ شہود پر لانے سے دنیا کی کوئی طاقت انہیں روک نہیں سکتی کہ ان کی نئی کتاب پر لکھنے کی تھکن اترنے سے پہلے کسی دوسری کتاب کے منظر عام پر آجانے کا خوشگوار دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اس صد فیصد حقیقت بیانی کو مبالغہ آرائی پر محمول نہ کیا جاےکہ اس کی سچائی کے جواز میں ہرگانوی کی کلاسیکی، روایتی، مروجہ، جدید، مابعد جدید نیز ملکی اور غیر ملکی نو بہ نو تجرباتی اصناف شاعری، تحقیق، تنقید اور ترتیب وتدوین پر مشتمل سیکڑوں تصانیف کے محض موضوعات اور موعنوانات کی فہرست پیش کروں تو اس تحریر کے لئے متعینہ صفحات کو اپنی تنگ دامانی پر شرمسار ہونا پڑے گا۔ اس پر مستزاد دنیا بھر کے رسائل وجرائد میں موصوف کی آئے دن مختلف الموضوعات اور نو بہ نو عنوانات پر مبنی مسلسل شائع ہوتی رہنے والی ہنگامی مسائل ادب پر بے شمار فکرانگیز تخلیقات کی بیکرانی کہ جن کے لئے سفینہ درکار ہو لیکن یہاں ان عمیق و بسیط اور بیکنا روسعتوں کے سمیٹنے کا محل نہیں کہ اسی کے لئے تو فرصت کے کئی رات دن درکار ہوں گے۔ یہ بارگراں اس ناتواں سے تو نہیں اٹھ پائے گا کہ اس کے لیے متحمل تو مناظر عاشق ہرگانوی کے فکروفن کی مختلف جہتوں پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے ریسرچ کرنے والے ہی ہوسکیں گے۔ مجھے تو موصوف کے سمندر آسا تنقیدی کار ناموں کی صرف اسی ایک جہت کا سرسری تجزیہ کرنا ہے جو زبان وادب کے بلامبالغہ سب سے قدآور اور مسلمہ عصر ساز ادیب، مفکر، مدبر، نقاد، محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہمہ گیر کارناموں کے محض ایک سب سے روشن پہلو ''تنقید کے چند گوشوں کی تفہیم وتعبیر پر مبنی ہرگانوی کی حال ہی میں منصہ شہود پر آنے والی وقیع، متنوع اور منفرد تصنیف ''تنقید کا نیا منظر نامہ اور گوپی چند نارنگ'' پر سرسری تبصرہ کرنا ہے۔

۱۶۸ صفحات پر محیط اس کتاب کے ایک تہائی حصے پر ''گفتنی'' عنوان کے تحت مناظر عاشق کا بقلمِ خود پیش لفظ ہے جو تمام تر نہیں تو بیشتر صاحب کتاب کے اس موضوع پر قبل ازیں ۱۹۹۵ء میں انجام پذیر ایک مزید عظیم القدر کارنامے ''گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی'' عنوان کے تحت ان کی تنقیدی کتاب پر مبنی ہے۔ اور بقول انہیں کے: ''جس سے نئی جہات کو روشنی ملی کیوں کہ نئی ادبی اور تنقیدی تھیوری کی نئی شناخت سامنے آئی۔ گوپی چند نارنگ نے اردو تنقید کی کشادہ فکری میں جو اضافہ کیا تھا اسے آفاقی وزن ملا''

مناظر عاشق ہرگانوی کے مطابق ان کے بیان کی سچائی کا جواز یہ ہے کہ ان کی اس کتاب کو ڈھائی درجن سے زائد ناقدوں اور دانشوروں نے سراہا جن میں سے ہندوپاک کے صف اول کے محض سولہ ثقہ ارباب فکر وبصیرت کے طویل یا مختصر مضامین، تبصروں اور آراء کے تانوں بانوں سے مناظر عاشق نے اپنی گفتنی کا دیدہ زیب ملبوس تیار کیا ہے۔ ان میں پاکستانی افق ادب کے آفتاب و ماہتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا'، انتظار حسین، مشفق خواجہ، قمر جمیل، فہیم اعظمی، افتخار عارف، ظفر علی سید، پروفیسر نظیر صدیقی، پروفیسر افتخار اجمل شاہین اور ہندوستانی افق ادب کے نظام صدیقی، بلراج کومل، محمد ایاز، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر بیگ احساس، کنور سین، رضوان احمد، ایس اے رحمان، سید احمد قادری اور پروفیسر محمد نظام کے نام نامی شامل ہیں۔ جن رسائل میں یہ تحریریں چھپیں ان میں دریافت (کراچی)، ڈان (کراچی)، اوراق (لاہور)، کتاب نما (دہلی)، سوغات (بنگلور)، ایوان اردو (دہلی)، قومی آواز (دہلی)، سب رس (حیدرآباد)، قومی تنظیم (پٹنہ)، بودھ دھرتی (گیا)، رنگ (دھنباد) کے نام ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی کی اس سابقہ کتاب کی روشنی میں اکابرین ادب کی موصولہ ان گرانقدر اور ذہن کشا آرا سے گوپی چند نارنگ کے ساختیاتی اور پس ساختیاتی (مابعد جدید) نظریات کی تفہیم نو کے لیے فکر ومعانی کے نو بہ نو آفاق روشن ہوتے ہیں اور پیش نظر کتاب میں مشمولہ صاحب فکر ونظر نقاد مناظر عاشق ہرگانوی کی فکرانگیز تحریروں کی قرأت اور ترسیل وتفہیم قاری کے لئے آسان تر ہوجاتی ہے۔ ہرگانوی نے اپنی اس کتاب میں فرانسیسی ساختیاتی مفکر رولاں بارتھ کی ساختیاتی اور پس ساختیاتی تنقید، کریو ین اور.... سے متعلق رولاں بارتھ کے نظریات کی تشریح اور وضاحت گوپی چند نارنگ کے حوالے سے روسی ہیئت پسندی کے تحت ساختیاتی مارکسیت اور نئی مارکسیت کا باضابطہ تھیوری کی مکمل آگہی کے ساتھ پانچ روسی مفکرین، لوسی ایس گولڈ فن، پیڑ ماشرے، لوئی آلتھیو سے، فیڈرک جیمسن اور ٹیری ایگلٹن کی فکر سازی کی روشنی میں مکمل اور منضبط انداز میں تنقیدی تعارف کرایا ہے۔ مضمون ''گوپی چند نارنگ اور ژاک

(بقیہ صفحہ 40 پر)

معین وقار رحمانی
Mob:9748582853

صابر ادیب کا ایک تحقیقی کارنامہ..."مرقع انقلاب بنام داستان عجیب"

اس کتاب کے تالیف نگار کا اصلی نام محمد حبیب اور قلمی نام صابر ادیب ہے۔جائے پیدائش ہمیر پور۔یوپی اور مسکن شاہجہان آباد، بھوپال ہے جو راجا، مہاراجا 'نوابین' جاگیر دار' شاعر وادیب اور ادب نواز اور بزرگانِ دین کا مسکن رہا ہے۔محترم موصوف اس مجموعے پُر وقار کے خوش کن نغمہ جاں فزا ہیں، جو اپنی نغمگی کی وجہ سے دبستانِ ادب میں محتاج تعارف نہیں۔اعلیٰ وارفع خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔اپنے تحریری آئینہ میں بھی نام سے اسم با مسمّیٰ نظر آتے ہیں۔حبیب اور ادیب کی آمیزش سے ان کے اندر ایک ایسا شگوفہ پھوٹا کہ زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر وسخن اور کشتِ ادب کی آبیاری میں مصروف ہو گئے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقی اور تالیفی کارناموں کے ساتھ ہی تحقیقی کاوشیں کشتِ زعفران بن گئیں۔ان کی کئی کتابیں مختلف اصناف پر منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔یہاں موصوف کی تالیف کردہ کتاب "مرقعِ انقلاب بنام داستانِ عجیب" زیرِ تبصرہ ہے۔

یہ دراصل ایک خودنوشت سرگزشت ہے جو موصوف کے پرنانا میر قادر علی نے جن کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران" کالا پانی" کی سزا ہوگئی تھی، انھوں نے اسی سزا کے دوران اس مضمون کو قلم بند کیا تھا۔اول اول جس کو میر قادر علی کے اکلوتے بیٹے ڈاکٹر امراؤعلی نے بکھری ہوئی تحریروں کو جو پڑھی جا سکیں' یکجا کر کے ملک کے آزاد ہو جانے کے بعد ۱۹۵۰ء میں مختصر تعداد میں (صرف خاندان والوں کے لئے) کتابی شکل میں چھپوائی تھی۔اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے اور اہمیت کو سمجھتے ہوئے ان کے پرناتی جناب صابر ادیب نے ۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سو سالہ (۱۵۰) سالگرہ کے موقع پر اس کی سرگذشت کو ترتیب دے کر ۲۰۰۷ء میں چھپوا کر منظرِ عام پر لایا۔اس طرح انھوں نے جنگ آزادی کے ایک حقیقی غازی اور سپاہی کو تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے۔

یوں تو متعصبین ہمارے کتنے ہی غازی وشہداء کو تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک کر بے نام ونمود کر چکے ہیں، لیکن نواسے نے اپنے نانا کو ایسی عظمت بخشی کہ خود بھی تاریخ کا ایک حصہ بن گئے۔جناب کا یہ ایک ایسا تاریخی کارنامہ ہے جو قابل تحسین اور موجبِ فخر وانبساط ہے۔کیونکہ میر قادر علی ان کے نانا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک انوکھے اور منفرد سپاہی تھے جنھوں نے اپنی شاہانہ طرز حیات پر جنگ آزادی کو ترجیح دیتے ہوئے مکار انگریزوں کی ذہن میں کڑواہٹ پیدا کر دی تھی اور مصائبِ عالم کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے فولادی جگر کا عملی مشاہدہ کیا تھا۔

میر قادر علی کون تھے، اور جنگ آزادی میں ان کا کیا رول رہا، باذوق قارئین کو ان کی مرتبہ کتاب "مرقع انقلاب سرگزشت میر قادر علی بنام داستانِ عجیب) (کالا پانی)" کے مطالعہ سے پتہ سے چلے گا۔

یہاں مختصراً واقعات اور ان کا تعارف یہ ہے کہ میر قادر علی ضلع جالون' قصبہ کالپی شریف۔یوپی کے وہ مرد مجاہد تھے جنھیں ضلع جالون میں جنگ آزادی کے مجاہدین میں اہم مقام حاصل ہے اور دوسری خاص بات یہ ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب مشہور بزرگ حضرت بختیار کاکیؒ سے جاملتا ہے۔

کالپی شریف بندیل کھنڈ ضلع جالون میں ایک ایسا قدیم قصبہ ہے جو جنگ آزادی کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔یہیں سے جھانسی کی رانی لکشمی بائی، راؤ صاحب اور باندا کے نواب بہادر ثانی کے علاوہ میر قادر علی جیسے سور ماؤں نے مورچہ بنا کر انگریزوں سے ٹکر لی تھی۔اسی تاریخی جگہ کالپی شریف میں آٹھ انگریزوں کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کے جرم میں ۱۸۵۸ء میں میر قادر علی کو' کالا پانی' کی سزا سنا کر انھیں انڈمان بھیج دیا گیا تھا۔میر قادر علی ضلع جالون کے مجاہدین میں وہ پہلے مجاہد تھے جنھیں جنگ آزادی کے دوران کالا پانی کی سزا سنائی گئی تھی۔انڈمان کی مشہور بندرگاہ پورٹ بلیئر میں ایک خر دماغ انگریز کی نفرت انگیز بد کلامی پر اس کی چھاتی میں انہوں نے ایک ایسا گھونسا مارا کہ وہ وہیں ماہئی بے تاب کی طرح تڑپ کر فوراً لقمہء اجل بن گیا۔اس نئے جرم کی پاداش میں انھیں اور ان کے ساتھی بھرت سنگھ اور قاضی روشن علی کو وہاں سے نیکو بار بھیجنے کا حکم صادر ہوا۔سفر کے آغاز میں ہی ایک انگریز محافظ سے پھر حجت وتکرار شروع ہو گئی۔انگریز محافظ اپنی فطرتِ قبیح کے مطابق لعن وطعن کرنے لگا۔منع کرنے پر وہ گالی گلوچ پر اُتر آیا۔مزید بھرت سنگھ کو اپنی سنگین سے مار کر سمندر میں پھینک دیا۔پھر کیا تھا میر قادر علی کا مجاہدانہ پارہ چڑھ گیا اور انہوں نے اپنے دوست قاضی روشن علی کے ساتھ مل کر کشتی کے پورے عملے ہی کو ختم کر کے دریا بُرد کر دیا اور کشتی کو اپنے قبضہ اور اختیار میں کر لیا۔کشتی کو توکلتُ علی اللہ کی کشتی بنا کر دشوار ترین بحر ودشت وجبل کے سفر ناممکنات پر نکل پڑے۔حوصلے پُر عزم تھے مگر منزل کا نشان معلوم نہ تھا۔اس کشتی میں ان کے ساتھ بحر عمیق میں حیات وموت کے فرشتے بھی ہم سفر تھے۔کہیں موت رقص کناں تھی تو کہیں زندگی مہربان ہو کر گلے لگا لیتی تھی۔

سطحِ سمندر میں پھیلے ہوئے بے شمار جزائر اپنی خصوصیات‘ اچھائی‘ اندوہنا کی کے باعث مشہور ہیں۔ وہاں کے چند جزائر پر راقم الحروف کا بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہر سمت نیلے اور کالے پانی پر چھوٹے چھوٹے پہاڑ‘ جنگلات‘ کہیں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں تو کہیں ٹاپو نما تنہا حسین نظارہ پیش کرتے ہیں۔ پانی پر پڑتی سورج کی کرنیں اور صاف وشفاف پانی پر رنگ برنگی خوبصورت مچھلیاں‘ بڑا ہی دلکش منظر ہوتا ہے----! سبھی پہاڑوں پر جانا ممکن نہیں ہے۔ لیکن جو آباد ہیں ان پر بہ آسانی جا کر اپنے ذوق کی تسکین کی جا سکتی ہے۔ بعض جگہیں پہاڑ اور جنگلات آج بھی غیر آباد ہیں جہاں جانا ممنوع ہے۔ جنگلی قوم میں جُرؔا قوم نہایت جارح و وحشی مانی جاتی ہے۔

آج سے تقریباً 155 سال قبل جب میر قادر علی انھیں پُر خطر راہوں اور جزیروں سے موت وزیست کے ہمراہ آنکھ مچولی کرتے ہوئے گزر رہے ہوں گے تو ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی یہ سوچ کر ہی روح لرزہ براندام ہونے لگتی ہے۔ کبھی کبھی حقائق پر مُبنی واقعات وسانحات بھی غیر یقینی سے لگتے ہیں لیکن کائنات مدّ و جزر ‘مخلوقاتِ ارضی وسماوی کے متعلق آج کا انسان بہت کچھ جانتے ہوئے بھی حشرات الارض کے علاوہ تمام عجائباتِ عالم سے کلّی طور پر ناواقف ہی ہے۔

میر قادر علی کو جزائر انڈمان نیکوبار میں عجیب الخلقت مخلوق کا نظر آنا‘ ان کی انسیت اور برادرانہ سلوک کے علاوہ دوسرے جنگلی خونخوار اور عجیب ہیئتی جانوروں سے نبرد آزما ہونا اور تقریباً ۹۰ فٹ لمبے اژدہوں کو مارنا‘ علاوہ ازیں انسان نما پرندوں کا مسحور کن گیت گانا وغیرہ یہ سب تعجب خیز نہیں‘ ممکنات کے یقین کے مطابق ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایسے وحشتناک سفر اور اندوہناک جگہوں سے میر قادر علی اپنے دوست قاضی روشن علی کے ساتھ سمندری سفر میں بھٹکتے ہوئے نو (۹) ماہ بعد اپنے ہم جنسوں سے صحیح وسلامت واپس آ ملے۔

دراصل یہ مشیت ایزدی تھی! کیونکہ میر قادر علی کو آزادی کا اٹوٹ حصہ بننا تھا۔ ان کے ساتھی قاضی روشن علی کی جوانمردی اور رفاقت کی بھی داد دینا پڑتی ہے کہ دوست کے قدم بہ قدم ہم سفر رہے۔ ذرا بھی نہ گھبرایے۔ مشکل ترین مراحل سے واپسی کو خدائے تعالیٰ کی رحیمی وکریمی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مفصل حالات ’مرقع انقلاب‘ میں درج ہے کہ وہ کن خوف ناک دشوار کن جزائر سے کس طرح گزرے۔ اس لئے یہ داستان عجیب داستان سے مرقع انقلاب کی صورت میں باذوق قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

گو کہ انگریزوں کے مظالم وتشدد کی داستان طویل اور دل ہلا دینے والی ہے۔ مگر انسانیت نواز میر قادر علی نے چوتھے جزیرے میں دو انگریزوں کو آدم خوروں سے بچایا اور ان کو ان کے وارثین تک پہنچایا۔ ان کی یقیناً یہی نیکی کام آئی اور وہ تمام الزامات سے بری ہو کر اپنے وطن عزیز کا لپی لوٹ آیے۔

ملک کی آزادی کے بعد عمر کے آخری ایام تک انھوں نے سرفروشوں اور مجاہدوں کی طرح زندگی گزاری۔ ساٹھ سال کی عمر میں مشیتِ ایزدی کے آگے سر خم کرتے ہوئے اور کلمۂ توحید پڑھتے ہوئے سجدے میں اِس عالمِ فانی کو خیر باد کہا۔ عجیب اور حیرت انگیز اتفاق ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش اور انتقال کا وقت ایک ہی ہے۔ پیدائش ۲۸/فروری ۱۸۲۲ء بوقت صبح اور انتقال ۲۸/فروری ۱۸۸۲ء بوقت ۹/ بجے صبح ہوا۔ یہ یکسانیت ایک مردِ خدا ہی میں پائی جاتی ہے۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے معمور رکھے۔

مذکورہ کتاب کے صفحہ ۶۰/ پر مرحوم کے شجرۂ حسب ونسب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جدِّ امجد میں محترم المقام شخصیتوں کے علاوہ مشہور ومعروف بزرگان دین کے اسم مبارک بھی شامل ہیں۔ بے شک میر قادر علی کے آلام ومصائب میں ان محترم ومکرم ہستیوں کی نیک دعائیں شامل رہی ہوں گی۔ میں ان تمام متبرک ہستیوں کو سلامِ عقیدت پیش کرتا ہوں جن کی دعاؤں کے طفیل میر قادر علی جنگ آزادی کے ایک سچے سپاہی وغازی بن کر ابھرے۔ ساتھ ہی محترم صابر ادیب کو بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں کیونکہ انھوں نے مرقع انقلاب کو اندرونِ خانہ سے منظرِ عام پر لا کر ایک مرد مجاہد کو تاریخ کے صفحات پر زندہ جاوید کر دیا۔!

☆☆☆

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی کتاب ”اردو درس وتدریس“ کو بہار اردو اکاڈمی کا انعام

۲۰۱۴ء میں شایع یہ کتاب اساتذہ اور تعلیمی ادارے یکساں مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کی افادیت کے پیشِ نظر بہار اردو اکاڈمی نے اسے انعام سے نوازا ہے جو ۱۵/ ہزار روپے نقد‘ سپاس نامہ اور سند کی صورت میں ہے۔

اس شرف یابی پر ادارہ ادبی محاذ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر ندیم احمد ندیم
لیکچرار این۔آر۔ایل سی۔پنجابی یونیورسٹی کیمپس
پٹیالہ۔147002

حیات بخش گیتوں کا بنجارا۔اسلم حبیب

گیت کاری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ساحؔر لدھیانوی کئی حیثیتوں سے منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔بے مثال تخیل‘ لاجواب اندازِ بیان‘ ذہانت وفطانت کے علاوہ ان کے کلام میں موجود ادبی چاشنی نے ان کے گیتوں کو حیات دوام عطا کی ہے۔ان کے انسانیت ساز گیت متاع انسانی کا خاصہ ہیں۔

مجھے اک گیت ایسا دے‘داغ داغ‘ اپنے گھر تک آ پہنچا ہوں اور میکدے پر چھاویں وغیرہ متعدد شعری مجموعوں کے خالق ڈاکٹر اسلم حبیب کی شاعری کا خمیر اسی پنجاب کی روحانی سرزمین سے وابستہ ہے جسے صوفی سنتوں نے اپنے سجدوں سے منّور کیا اور اس کی فضاؤں کو دعاؤں اور گاتھاؤں نے معطر کیا‘ جہاں قدرت نے لہراتے بل کھاتے مست دریاؤں کی سرشاری سے اس خطے کو شادابی بخشی اور اس کی لہلہاتی سرزمین اور گنگناتی ہواؤں نے نغمگی میں اضافہ کیا۔اسی پنجاب کے لیے راجندر سنگھ بیدی نے بڑا معنی خیز جملہ کہا تھا ”اس کے دریا تو ایک طرف پوکھر بھی انوراگ سے واقف ہیں“اس انوراگ اور دلکش نظاروں کا اسلم جیسے حساس اور بالیدہ شاعر کی شاعری میں سما جانا قدرتی ہے یعنی ان کی تہذیب پنجابی ہے اور جب یہ تہذیب وتمدن وسعت پذیر ہوتا ہے تو ان کے شعر وسخن کا مزاج بالکل ہندوستانی ہو جاتا ہے اور یہ ہندوستانی مزاج ہی اصل میں ”گیت“ کی بنیاد ہے۔گیت ایک خیال‘ ایک جذبے اور ایک کیفیت کا نام ہے۔اس کی نوعیت گانے اور نغمے سے قدر مختلف ہے۔

”گیت“ ایک مذکر لفظ ہے اور سنسکرت کے مؤنث لفظ ”گیتا“ سے ماخوذ ہے اور یہ سوال بھی بحث طلب ہے کہ یہ لفظ پہلے ہندی میں استعمال ہوا یا کہ اردو میں۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ اردو کے مقابلے میں ہندی میں گیت کی روایت زیادہ مربوط ومنظّم نظر آتی ہے۔گیت کے لغوی معنی راگ‘ بھجن‘ سرود اور نغمے کے لیے جاتے ہیں۔یعنی گیت شاعری کی وہ وصف ہے جس میں نغمگی اور غنائیت کی فراوانی ہوتی ہے‘ جس میں شخصی جذبات وکیفیات کو بے تکلفی سے پیش کیا جاتا ہے۔مختصر طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک داخلی صنف ہے۔جہاں تک گیت کی ہیئت کا سوال ہے تو اس کے لیے کوئی خاص تکنیک‘ ہیئت‘ بحر‘ وزن یا ساخت متعین نہیں ہے۔گیت کسی بھی ہیئت اور وزن میں لکھے جا سکتے ہیں مثلاً خالص گیت‘ غزلیہ گیت‘ نظمیہ گیت‘ ماہیا گیت اور دوہا گیت وغیرہ وغیرہ۔

زبانوں کے باہمی رشتے بہت ہی دلچسپ ہوتے ہیں۔یہ کبھی ایک ہوتے ہوئے بھی منفرد مزاج رکھتی ہیں اور کبھی مختلف ہوتے ہوئے بھی یکجہتی کی مثال بنتی ہیں۔مثال کے طور پر اردو اور ہندی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔گیت کے سلسلے میں جب یہ دونوں زبانیں مل کر ہندوستانی روپ اپنا لیتی ہیں تو اس کی انفرادیت کا الگ ہی انداز ہوتا ہے۔اسلم کے یہاں بھی اس طرح کے کامیاب تجربے ملتے ہیں ۔

ہم ہیں نربل تو بلوان تو ہے ہم ہیں مجبور تو مختار تو ہے
ہم تیری بیٹیاں ہیں ودھاتا تو ہی بابل ہے داتا تو ہے

یا پھر وہ کہتے ہیں ۔

میرا جیون ایک نیا ہے/تو ہے کھیون ہار سوامی
کب سے کھڑا ہوں بیچ بھنور میں/اب تو لگا دے پار
سوامی تو ہے کھیون ہار

اردو ادب میں گیت کی شروعات ادب کی تخلیق کاری کے ساتھ ہی ہوئی لیکن باقاعدہ ابتدا طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو سے مانی جاتی ہے۔مختلف زبانوں پر قدرت رکھنا اور ان کا فنکارانہ استعمال‘ کلام خسرو کا خاصّہ ہے ۔

کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کِسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
نہ نیند نینا‘ نہ انگ چینا‘ نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

اسی طرح دکن میں پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلؔی قطب شاہ کے گیت بھی ہندوستانی کا خوبصورت مرقع ہے ۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا پیا باج اِک تل جیا جائے نا

دکن میں قلؔی قطب شاہ کے علاوہ علی عادلؔ شاہ‘ ولؔی دکنی اور ملاّ وجہؔی کے یہاں بھی گیت کی روایت موجود ہے جب کہ شمالی ہند میں افضؔل جھنجھانوی‘ خواجہ امیؔن‘ عزلتؔ‘ کے نام قابل ذکر ہیں اور ساتھ ہی ایک اہم نام آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفؔر کا بھی ہے۔لکھنؤ میں نواب واجد علی شاہ اور امانتؔ لکھنوی نے اس صنف کو تقویت پہنچائی۔اس کے بعد عظمتؔ اللہ خاں‘ آرزو لکھنوی‘ حفیظ جالندھری‘ میرا جؔی‘ اختر شیرانی‘ قیوم نظر‘

،مجروحؔ سلطان پوری، کیفیؔ اعظمی شکیلؔ بدایونی، جان نثار اخترؔ، قتیلؔ شفائی، ساحرؔ لدھیانوی سے ہوتے ہوئے ندافاضلی، زبیر رضوی، سوہن راہیؔ، بیکل اُتساہی اور اسلم حبیب تک گیت میں جو تجربات ہوئے ان کے نقوش اسلم کے گیتوں میں بھی نمایاں ہیں۔

ہمارے دیش میں عورت کو محبت، ممتا اور وفا کی دیوی تصور کیا جاتا ہے اور جب یہ وفا کی دیوی کسی مرد سے (باپ، بیٹا، بھائی یا محبوب) سے محبت کا اظہار کرتی ہے یا اُس کے فراق میں تڑپتی ہے تو اُس کے تمام جذبے گیت میں ڈھل جاتے ہیں ۔اسلم کے کلام میں اس روایت کی پاسداری بخوبی ملتی ہے ۔

دل کی اگن بجھاؤنی سیّو !یار کو ڈھونڈ کے لاؤنی سیّو سنتی ہوں وہ دل کا
رانجھا، ڈھونڈ و تخت ہزارے رسوہنی کا مہوال ہے کوئی دیکھو دریا کنارے
وہ ہرجائی دنیا بھر کا جاؤ دوارے دوارے رگھر گھر الکھ جگاؤنی سیّو

اسی جذبے سے ہمارے صوفیوں نے نیا پہلو نکالا۔انھوں نے اپنے مالک حقیقی کو ہی کبھی اپنا معشوق تصور کرتے ہوئے اپنے بالوں کو دراز کیا اور زنانہ لباس پہنے اور کبھی خدائے برتر کو ایک شفیق باپ کا درجہ دیتے ہوئے پکار اٹھے ۔

بابل تو سلطان/ ہم بچے نادان/ پھر بھی مانگیں دان

یا پھر یہ انداز ملاحظہ کریں ۔

چھوڑ کے تیرے محل دو محلے/ اب بابل میرا جی نہ بہلے ردھو کے کھائے دنیا بھر سے/ کیوں نکلی میں تیرے گھر سے رستہ بھول گئی/ تیرے گھر سے جو نکلی بابل/ رستہ بھول گئی

تصوف اور معرفت سے لبریز اسلم کا کلام جہاں ان کے اندر چھپے ہوئے صوفی کی صفات کو اجاگر کرتا ہے وہیں حقیقتوں کی پردہ کشائی بھی کرتا ہے۔

وہ میرا ہے میں اس کی ہوں بس اتنی سی بات
میں کیا جانوں کیا کہتی ہے گیتا اور توراۃ
پانچ نمازیں لوگ پڑھیں پر میری نماز مسلسل
تیرے پیار میں دیوانہ تجھ کو پکاروں ہر پل
قریب آ، قریب آ، مرے خدا قریب آ
قریب آ..........

گیت کی خوبی یہی کہ اس کے الفاظ کا آہنگ ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ زبان پر آتے ہی روح کے نہاں خانوں میں لرزشیں سی ابھرتی ہیں اور جسم مضمحل ہو کر خود بخود وجد کرنے لگتا ہے۔گیت کے تخلیقی عمل میں کوئی بناوٹ یا تمہید نہیں ہوتی بلکہ جذبات کو بے تکلفی سے پیش کیا جاتا ہے۔یہ بیساختہ پن اور معصومیت ہی ہے جو کبھی تمام انسانوں کے دکھ درد کو ایک دل میں بھر دیتی ہے تو کبھی ایک دل کا درد تمام انسانوں کے دکھ کا درپن بن جاتی ہے اور یہ کیفیت ہی اس اداسی کو جنم دیتی ہے جو سب کو بھلی لگتی ہے اور اپنی طرف متوجہ کرتی ہے ۔

زخمی پڑی ہے میری سرگم گھائل ہیں سُر تال
گھائل ہیں سُر تال رے ساتھی کیسے گیت سناؤں
کیسے گیت سناؤں رے ساتھی
گھائل ہیں سُر تال
وار دکھوں کا سہتے سہتے ہو گیے گیت کٹیلے
بچھڑے ہم سے کیسے کیسے بانکے یار سجیلے
اور نہ ہم سے بن پائیں گے اب جینے کے حیلے
اب تو کسی بھی طور ہو لیکن ختم ہو یہ جنجال
رے ساتھی گھائل ہیں سُر تال

اور کون ہے جو اس یتیم بچے کی پکار کو سن کر ان سنی کر سکتا ہے ۔

یہ شفقت کیسی ہوتی ہے، یہ سایا کس کو کہتے ہیں
یہ اپنے کون ہوتے ہیں، پرایا کس کو کہتے ہیں
بڑی الجھن میں ہوں، الجھن مٹا بھی جاؤ اب پاپا
میں دنیا میں بہت تنہا ہوں آ بھی جاؤ اب پاپا
مرے دل کی اداسی کو مٹا بھی جاؤ اب پاپا

اور جب یہی یتیم بچہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے بڑا ہن کر اپنی بڑی بہن کے سر پر دست شفقت رکھتا ہے تو اسلم کے جذبات یوں لوری اور گیت میں ڈھل جاتے ہیں۔

تجھے جھولا جھلاؤں، تجھے لوری سناؤں، سو جا بیٹا
یہ ہے سپنوں کا گاؤں، میرے اپنوں کا گاؤں، سو جا بیٹا
دور پربت کے پیچھے ایک چاند کھلا ہے، پیارا پیارا
باگ گھوڑے کی تھامے، شاہزادہ کھڑا ہے، پیارا پیارا
اس کا نام بتاؤں، تجھے لوری سناؤں، سو جا بیٹا
کل جو سورج اُگے گا، بھاگ اپنا جگے گا، پیارا پیارا
دکھ کا بادل ہٹے گا، سکھ کا پھول کھلے گا، نیارا نیارا
گل کی خوشبو چراؤں، تجھے لوری سناؤں، سو جا بیٹا

ان جذبات و خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ فن سخن میں اسلم غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہیں۔اُن کا لفظ لفظ ایک خوشبو ہے اور یہ خوشبو مستحسن بھی ہے خوش گوار بھی، جس میں پاکیزگی اور بالیدگی کا عنصر نمایاں ہے۔وہ جب گیت گنگناتے ہیں تو یک لخت کتنے ہی جذبے روشن ہو جاتے ہیں اور جیون رت کے کتنے ہی موسم مہکنے لگتے ہیں۔جذبوں کا یہ سفر امید افزا بھی ہے اور حیات بخش بھی ۔

جب کلی کوئی مسکائے/ جب بھونرا گن گن گائے/ جب چاند افق پر آئے رجب بادل گھر گھر جائے/ جب جگنو چمکے بن میں/ جب مستی چھائے من میں/ میں تیرے سپنے دیکھوں

لفظ اور جذبے سب کے پاس ہوتے ہیں لیکن ان کا انتخاب، پیش کاری اور پرکاری ہی اصل ادا ہوتی ہے جو کسی کو ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ مجھے امید واثق ہے کہ اسلم کا کلام منظرِ عام پر آتے ہی باشعور اور سنجیدہ قارئین کا پسندیدہ موضوع بن جائے گا۔ میں اپنی بات کو ڈاکٹر اسلم حبیب کے ہی الفاظ کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ ۔

روح کو گیت، تو گیتوں کو صدا دے کے چلے
دھوپ پائی ہے مگر کالی گھٹا دے کے چلے
ظلم اور جبر نہ راون کا ہنر آتا ہے۔ ہم فقط پیار ہیں، یہ پیار مگر آتا ہے
ساری دنیا کو یہ جینے کی ادا دے کے چلے

☆☆☆

(مناظر عاشق ہرگانوی کا نیا تنقیدی کارنامہ کا بقیہ)

دریدا کے ردِ تشکیلی نظریے کا مفصل تجزیہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح ''گوپی چند نارنگ اور ژاک لاکاں'' میں دس ساختیاتی مفکرین میں ژاک لاکاں کو اہم گردانتے ہوئے اس کے تحلیلِ نفسی اور نو فرائڈین نظریے پر نارنگ صاحب کی تفصیلی بحث کا تجزیہ ہرگانوی صاحب نے دلپذیر انداز میں پیش کیا ہے۔

عالمی ادبی منظر نامے پر حد درجہ نمایاں ان روسی اور فرانسیسی مفکرین کے ادبی اور تنقیدی نظریات کی روشنی میں اردو تنقید کے اپنی روایتی اور فرسودہ ڈگر سے ہٹ کر نئی راہیں دریافت کرنے اور ان پر کامیابی کے ساتھ گامزن ہونے کے کس حد تک امکانات ہیں اپنے فکر انگیز اور مدلل مباحث کی روشنی میں نارنگ صاحب نے رہنمائی کا خاطر خواہ فریضہ انجام دیا ہے۔ نارنگ صاحب کے ان مضامین کی اپنی تجزیاتی تحریروں کی روشنی میں مناظر عاشق ہرگانوی نے عام قاری کے لئے ان کے تنقیدی نظریات کی ترسیل و تفہیم کی راہیں ہموار کر دی ہیں۔ علاوہ ازیں ماہنامہ ''صریر'' کراچی میں مطبوعہ گوپی چند نارنگ کے مضمون ''قاری اساس تنقید'' کا مفصل تجزیہ کرتے ہوئے مختلف مغربی نقادوں کے تنقیدی نظریات کی روشنی میں نارنگ صاحب کی پیش کردہ تنقیدی تھیوریوں کا ہرگانوی نے جامع اور دلکش انداز میں محاکمہ پیش کیا ہے۔ کتاب کا اگلا مضمون نارنگ صاحب کی اردو تنقید کے نئے دبستان سے باضابطہ روشناس کرانے والی معرکتہ الآرا کتاب ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' پر ہرگانوی کا بسیط اور چشم کشا تبصرہ ہے۔ اردو میں ساختیات کے نظریہ سازوں میں فہیم اعظمی، قمر جمیل، قاضی قیصر الاسلام، نظام صدیقی، وہاب اشرفی، ابوالکلام قاسمی، شافع قدوائی، محمد حسن، اسلوب احمد انصاری، شارب ردولوی، ناصر عباس نیر، لنڈا ویٹنگ وغیرہ کے نام گنوا کر گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا کی ساختیات کی نظریاتی بنیادوں پر بحث کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے لئے نارنگ صاحب کے پراگ کے لئے کیے گیے سفر کا ہرگانوی نے بطور خاص حوالہ دیا ہے جہاں ماسکو سے جلا وطن کیے گیے روسی ادیب پناہ گزیں تھے جو ساختیات کے اولین بنیاد گزاروں میں شمار ہوتے تھے۔ ساختیاتی نظریاتی بنیادوں پر نارنگ صاحب کی تحریروں کا اس مضمون میں مفصل تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کی اگلی تحریر کافکا اور میلان کندیرا کے ملک چیکوسلواکیہ کے شہر پراگ کے تعلق سے مناظر عاشق کا نارنگ صاحب سے لیا گیا انٹرویو ہے جس سے چیکوسلواکیہ کا ادبی منظر نامہ روشن ہوتا ہے۔

نارنگ صاحب کے اپنے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں کے لئے معقول، مدلل اور کافی وشافی جواب میں دلکش طنزیہ اسلوب میں تحریر کردہ وضاحتی مضمون ''ہیئتی تنقید اور کوہان کاڈر'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ہرگانوی نے بھی نارنگ صاحب کے مضمون والا تیکھا، کٹیلا اور دلکش لب و لہجہ اختیار کیا ہے جو مضمون کو دوآتشہ بنا دینے کا موجب ہے۔ ضمیمہ کے طور پر نارنگ صاحب کا مضمون بھی کتاب کے اختتامی صفحات پر بطور قندِ مکرر شامل ہے۔ نارنگیات میں ایک خوشگوار اور بیش بہا اضافہ یہ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے!

☆☆☆

محمد نوشاد نورنگ
No-2,Raushan kiran Apartment
1-RaviNagar.KhazranaRoad
INDOREE-452015(M.P)

یہاں جب سانحہ کوئی مثالِ کربلا ہوگا
تو پھر شبیر کوئی حق کی جانب سے کھڑا ہوگا
سبھوں کے غم کو اپنا غم سمجھنے کی ہو گر کوشش
جہاں کو دیکھنے کا یہ نیا اک زاویہ ہوگا
بہے گا خونِ ناحق جب تڑپ دل میں مرے ہوگی
مرا کربِ دروں چہرے سے میرے رونما ہوگا
ترے بندے تری رحمت کے ہیں محتاج اے مولیٰ
کرم ہوگا ترا غیروں پہ تو اپنوں کا کیا ہوگا
تری چوکھٹ پہ سجدہ ریز ہوتے ہیں ہمیشہ ہم
نہیں معلوم محشر میں ترا کیا فیصلہ ہوگا
ہمیں سے رونقِ دنیا، ہمیں سے رونقِ جنت
نہ ہوں گے ہم اگر تو یہ جہاں ویراں پڑا ہوگا
نئی تہذیب لائی ہے چلن یوں بے حیائی کا
ہر اک آدم کا بیٹا بنتِ حوا کی ردا ہوگا
دکھی انسانیت کو دیکھ کر یہ دل میں ٹھانی ہے
کہ نورنگ خدمتِ خلقت پہ ہر لحظہ کھڑا ہوگا

ڈاکٹرسید غلام ربانی آیاز سمبلپوری
E.A.C.Colony.BehindCourt
Raipur-492001(C.G)
Mobile:08305893443

منظر اعجاز کا رنگِ سخن

عالی جناب ڈاکٹر منظر اعجاز معلیٰ القاب ذی شعور شاعر نقاد صحافی ناول نگار اور ماہر اقبالیات ہیں. آپ پٹنہ کے اے این کالج کے شعبۂ اردو کے صدر بھی ہیں۔ یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ اُن کی صاحبزادی فرخندہ اعجاز کی شادی خانہ آبادی میری اہلیہ مہر نگار کے سگے ماموں زاد بھائی جناب سراج الدین صاحب کے نور چشم جمشید میاں کے ساتھ ہوئی اور میں باراتی کے طور پر پٹنہ گیا تھا۔ میں نے اس موقع پر سہرا بھی پڑھا۔ دوسرے دن ۲۳/ دسمبر ۲۰۱۴ء کو منظر اعجاز صاحب نے اپنا شعری مجموعہ 'ورق ورق اُجالا' مجھے تحفتاً اظہار خیال کے لیے پیش کیا۔ اس کتاب کو بہار اردو اکادمی کے تعاون سے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب مجھے للکارتی رہی' میں اُسے آہستہ آہستہ لغت کی مدد سے پڑھتا رہا۔ ایک سال بعد جب مجھ میں کچھ خود اعتمادی آئی تو اپنا خیال ظاہر کرنے کی مودّبانہ گستاخی کر بیٹھا ہوں۔ خیر۔

اُن کی معجز بیانی سر آنکھوں پر لیکن اُن کی معرکتہ الآرا کتاب خوش بیانی کے گرداب میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ اُن کے خیال کا پیچیدہ پن، لفظیات کی ستم ظریفی، طنز آمیز صورتِ حال، ذہنی اُلجھاؤ' اظہار کا ترچھا پن اُن کی شاعری کی پیچیدگی کا معنی خیز اظہار ہے۔ اس کو پڑھ کر مجھ جیسے غریب قاری کا حال خلا میں معلّق تری شنکو جیسا ہو جاتا ہے اور اُسے یہ ماننا پڑتا ہے کہ غزل کی لطافت نکتہ پردازی میں ہے۔ اس سے سخن میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

کسی قدر آج بھی منظر ہے قیامت انگیز۔ ترا اندازِ تبسم، مرے آداب کا رنگ

یہ شعر رومانی ہو کر بھی غیر رومانی ہے۔ اب یہ بھی شعر دیکھیں:۔

جب کسمسائی سانسوں میں خوشبو حیات کی۔ رکھ کر زبان کانٹوں پہ پھولوں سے بات کی

اس شعر کا ثانی مصرع بعید از قیاس لگتا ہے۔ باہر سے بات بھلے ہی بے تکی لگتی ہو اندر سے سچائی ظاہر کرتی ہے۔ اصلی شاعری تو PARADOXICAL ہے جو بظاہر مہمل مگر در حقیقت صحیح بات ہے۔ اس میں سقراطی طنز ہے' جو زندگی کی ستم ظریفی کو تجاہلِ عارفانہ کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔ یہی منظر اعجاز کی شاعری کا جوہر لطیف ہے۔ اُن کی فصاحت اور بلاغت کے مدِ نظر اُنھیں پُر شکوہ الفاظ کا بادشاہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ اگر وہ بنیادی حقیقت میں خدا کا رنگ دیکھ لیتے تو اُن کا قنوطی رنگ پُر اُمید رجائیت پسند ہو جاتا مگر بیم و رجا سے پرے دیکھنے والا دیدہ ور بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ مزید برآں ان کی چند غزلوں کو عروض کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا تو وزن صحیح نکلا۔ نمونے کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھیں، جن کا وزن فاعلاتن فاعالاتن، فاعلن ہے:۔

تھا پسِ آئینہ جب تک زنگ تھا۔ پیشِ آئینہ ہوا تو رنگ تھا

آج بھی سر چشمۂ تخلیق ہے۔ کل بھی وہ تکوین کا فرہنگ تھا

ساز کا ہر تار تھا منظر خموش۔ چھیڑتے ہی اک ذرا آہنگ تھا

جناب وہاب اشرفی صاحب نے منظر اعجاز کو فکری کشاکش کا شاعر نامزد کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ موصوف Contradiction,Irony,Satire کے شاعر ہیں۔ بلکہ اُن کا کلام paradox کے جوہر سے بھرپور ہے۔ جناب ظفر ندیم نے بھی کہا ہے کہ ڈاکٹر منظر اعجاز کی شاعری Complexity پر زندہ ہے۔

ہر کسی ماہر فن کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی رائے دے لیکن میں کسی شاعر کو دوسروں کی نگاہ سے نہیں اپنی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ عرض یہ ہے کہ ایک عام قاری میر، غالب اور اقبال کو پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن منظر اعجاز اُن سے بھی کہیں زیادہ سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ یہ ان کے فکر اور ادراک کا کمال ہے۔ قاری کی مشکل آسان تو ہو گی مگر مشکل سے۔ اُن کی فکر انگیز غزلوں سے اُن کی شناخت ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی صلاحیت اور ذہنی توانائی کا پتہ چلتا ہے۔ اگر اُن کی غزلوں کے سیپ میں موتی مل جایے تو پھر لطف ہی لطف ہے لیکن یہ کام کچھ طرح دے گیا ہے۔

بہر حال منظر اعجاز کی شاعری عجیب تناقض اور غیر معمولی تضاد کا آئینہ ہے۔ جس پر مزاج اور ماحول کے تصادم سے بال آ گیا ہے۔ ان کی ذہنی فکر تناؤ پیدا کرتی ہے۔ اگر وہ 'ہاں' اور 'نہ' کی کشاکش کو رد کر دیتے ہیں تو ایک مختلف قسم کی شاعری وجود میں آ سکتی ہے لیکن یہ نا ممکن ہے کیوں کہ وہ اثبات اور نفی میں حامی دیکھنے کے عادی ہیں اور چونکہ یہ اُن کا نصب العین ہے وہ اسے بڑے سلیقے سے نبھاتے ہیں۔

الغرض ان کی شاعری میں جو شستگی' سپردگی پائی جاتی ہے شاید نقّالوں کو پسند نہ آئے۔ اُن کے مجموعۂ کلام ''ورق ورق اُجالا میں'' پُر گو ہمہ جہت اُن کی شاعری تو ہے ہی اُس کے علاوہ چھوٹی ،تازہ،شگفتہ،بحروں میں کمال کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ لوچ' ترنم کے پُر تاثیر اشعار میں سے کچھ ملاحظہ فرمائیں۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں لیتی ہیں امید پناہ۔ نہ جانے کیسی کشش اب بھی دشت یاس میں ہے

یہ وہ جگہ ہے جہاں سمتیت بھٹکتی ہے۔ کوئی تو ہو جو مجھے چھوڑ دے مرے گھر تک

اور یہ شعر بھی دیکھیں کہ لفظوں کی اُٹھان کس طرح خیالوں کا زینہ بناتی ہے۔

چہرہ بھی، آئینہ بھی اور پردہ دار جلوہ بھی۔ پیشِ منظر بھی تو ہی تو ہی پس منظر بھی ہے

ان کی شاعری حرفی اور لفظی تکرار میں خوب سنورتی ہے۔ دیکھیں ایک ہی لفظ کا دہراؤ ایک خاص اثر پیدا کرتا ہے: ورق ورق، رنگ رنگ، خواب خواب، شکن شکن، لہو لہو، مبہم مبہم، قدم قدم، پلک پلک، نظر نظر، ریزہ ریزہ، حرف حرف وغیرہ۔

اسی طرح صفحہ 47 پر دی گئی غزل نمبر 13 تشبیہات کی عالی شان مثال ہے۔ یہ دو اشعار بھی دیکھیں:۔

یہ لہو رنگ تمنّاؤں کا شیرازہ ہے۔ جھلملاتا ہو جو پلکوں پہ ستاروں کی طرح
نفس نفس میں مہک بھینی بھینی خوشبو۔ نظر نظر میں شبِ انتظار ہو جیسے

مزید برآں اضافت کی فارسی ترکیب سے خوبصورت استعارے تیار کئے ہیں جو لفظی تصویر بنانے میں معاون ہیں:۔ حرفِ لا، خالقِ ادنیٰ، فکرِ انسان، زخمِ تمنّا، حریمِ فکر، چشمِ خود شناس، نقشِ جمیل، حرفِ عبارت، رنگِ نظر، برگِ گل، ربابِ دل، جذبۂ شوق، لمحۂ شب گیر، لوحِ محفوظ، سوز دل، دلِ غیور، نگاہِ نور، راز طور، طرزِ تغافل، منظر شعور، پابندِ نگاہ، میزانِ نظر، روحِ انا، سکونِ دل، غمِ حیات، بساطِ شوق، مشامِ جاں، گردشِ وقت، بارشِ سنگ، صوتِ اذاں، سنگِ نشاں، حشتِ مکاں، دشتِ جہاں، قصری زباں، حرفِ اعتبار، فصیلِ دار وغیرہ۔

تلمیحات کا جلوہ دیکھیں:۔

خضر بھی، موسیٰ بھی میں، رہ گزر شوق بھی میں۔ خود مسافر بھی ہوں میں اور خود ہی نمائندہ ہوں
نغمۂ روح حدیثِ دلِ بیتاب سہی۔ پڑھ نہ پھر بھی اُسے قرآن کے پاروں کی طرح
امن کا امکان نہیں سوزِ بلالی کے بغیر۔ کعبۂ عشق میں ہو صوتِ اذاں کی تعبیر
حق و باطل کی کشاکش سے ملی کس کو نجات۔ بدلے منظر نہ براہیمؑ نہ آزر بدلے

یقیناً منظر اعجاز کی شاعری اُن کے عقل و خرد کی عکاس ہے۔ جس میں حیات و ممات کی تجلیات جلوہ افروز ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی خداداد صلاحیت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ منظر اعجاز نقاد ہوتے ہوئے بھی سخنوری کے تمام لوازمات و واجبات کے ساتھ شاعری کو معراج تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ماسوا وہ اپنا مخصوص رنگ لے کر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ جیسے کہ ''جہاں بھی پہنچی نظر رنگ رنگ منظر تک''، ''مرجھایا ہوا ہونٹوں کا تبسم اڑا ہوا تصویر کا رنگ''، ''رنگ رنگ ہر صبح کا منظر جیسے خواب دوانے کا''، ''فسوں رنگ تجلّی خواب زار نہ دے''، ''یقین کا رنگ بھی ہے وہم کا غبار بھی ہے''، ''میری تعبیر کا آئینہ مرے خواب کا رنگ''، ''حسنِ عروسِ فکر، دلِ دیدۂ تر کا رنگ''، ''رنگ خوشبو، گلاب کی سوگندھ، منفرد رنگ، یہ آہنگ غزل کا لے جا''، ''جو بھی تھا اک عالمِ نیرنگ تھا وغیرہ سے منظر اعجاز کا مخصوص رنگ عیاں ہوتا ہے۔

میری نظر میں ان کا پورا مجموعہ کلام ''ورق ورق اُجالا'' ایک طویل استعارہ ہے، جس پر غور و خوض کریں تو اُن کا فلسفۂ حیات اُبھر کر سامنے آجائے گا جو ایک صوفیانہ طرزِ حیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آگے یہ بھی کہتا چلوں کہ منظر اعجاز کی شاعری کے بارے میں یہ عام رائے بن پائی ہے کہ جناب نہایت ذی فہم شاعر ہیں لیکن اُن کی شاعری صرف قابل فہم قاری کے لئے قابل فہم ہے۔ وہ غیر مانوس ثقیل لفظیات کا لبادہ اُتار نہیں سکتے۔ عام قاری کے لئے مسئلہ یہ ہے کہ عشق حقیقی تک اُس کی رسائی مشکل ہے۔ اس لئے عشق مجازی کے حصار میں رہ کر اُسے رمز و راز کی باتیں سمجھائی جائیں۔ اس بات کو قبول کرتے ہوئے وہ کہتے بھی ہیں کہ۔

منظر یہ غزل والے اسلوب غزل سمجھیں۔ تم حرفِ علامت میں جذبوں کا اثر دیکھو
ساز میں سوز ہے آواز میں باقی ہے کھنک۔ چند سانسوں کے تقاضے پہ ابھی زندہ ہوں

کاش وہ صفحہ 37 کی غزل کا لب و لہجہ اختیار کر سکتے جس میں بھارت کی مٹی کی مہک آتی ہے۔

رات کی بھیگی پریاں جیسے صبح سویرے پر پھیلائے
اِندرلوک سے دیکھ رہی ہیں چھبتی کٹیلی دھوپ کا موسم

اس لئے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

منظر وہ غزل کا رنگ کہاں، وہ جذبوں کا آہنگ کہاں
شعروں میں کہاں وہ کیف و اثر، جب دل ہی عشق آزار نہیں

پھر بھی صفحہ 52 پر دو دو مقطعوں کا استعمال بھی لاجواب ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

میں اپنے آپ سے بے زار ہوں منظر۔ مرے وجود سے برہم ہیں کیوں اثر والے
وہ چاہتے تھے کہ ہو دردِ آگہی دل میں۔ کچھ ایسے لوگ تھے منظر جنوں کے سر والے

غزل نمبر ۴۵، صفحہ ۱۰۹ کی غزل کا چونکانے والا مطلع ہی مقطع کے طور پر شروع ہوا ہے۔

حسنِ عروس فکر، دل دیدۂ تر کا رنگ۔ منظر یہ کائنات ہے ذوقِ نظر کا رنگ

مجھے یقین ہے کہ اپنی نوعیت کی یہ امتیازی کتاب سیاق و سباق کے حوالے سے شعری حلقوں میں اہم مقامات نہ صرف حاصل کر چکی ہے بلکہ آگے بڑھتی رہے گی کیونکہ اس میں آفاقی شاعری کے تمام اجزاء موجود ہیں۔

بالآخر منظر اعجاز کی شاعری کا میزانِ کُل یہی ہے کہ اُن کے شعر و سخن کا رنگ خوب نکھرا ہے۔ مثلاً (۱) جہاں بھی پہنچی نظر رنگ تک (2) مرجھایا ہونٹوں کا تبسم اُڑا ہوا تصویر کا رنگ (۳) رنگ رنگ ہر صبح کا منظر جیسے خواب دیوانے کا (۴) فسونِ رنگ تجلّی آب زار نہ دے (۵) یقین کا رنگ بھی ہے وہم کا غبار بھی ہے۔ (٦) میری تعبیر کا آئینہ مرے خوب کا رنگ (۷) حسنِ عروس فکر، دل دیدۂ تر کا رنگ (۸) رنگ، خوشبو، گلاب کی سوگند! (۹) منفرد در رنگ یہ آہنگ غزل کا لے جا (۱۰) جو بھی تھا اک عالم نیرنگ تھا۔

نیز اُن کی فارسی زدہ شاعری میں اضافت کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ اس کے برعکس عطف کا استعمال آٹے میں نمک کے برابر ہے، جیسے سوز و ساز، من و عن، نیاز و ناز، ہندی الفاظ نہایت کم ہیں۔ گاڑھے لفظوں کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ چونکہ اُن کا کلام تمثیلات کا پیکر ہے، خاص و عام قاری کی سمجھ میں آجائے تو کیا بات ہے! منظر اعجاز کے ideolect پر اچھا تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔ ☆☆☆

صبیحہ جہاں (ریسرچ اسکالر)
Lecturer,Dept. Of Urdu
PadmashiriInstitute of
Management&Science
Bangalore

رؤف خوشتر کی کائناتِ طنز و مزاح

ریاستِ کرناٹک کے مزاح نگاروں میں ایک معروف نام رؤف خوشتر کا بھی ہے۔ اِن کا شمار کرناٹک کے صفِ اول کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ جناب رؤف خوشتر کا اصلی نام عبدالرؤف ہے۔ آپ شعلہ پور (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی محکمہ سے وابستہ رہے۔ گلبرگہ میں ملازمت کے دوران آپ ظرافت نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور بیدر سے بحیثیت پرنسپل ریٹائرڈ ہوئے اور آج آپ طنز و مزاح میں مُلک گیر شہرت کے حامل ہیں۔ آپ کی تین کتابیں ''غبارِ حاضر''، ''آنکھ بیتی''، اور ''صرف درباں'' منظرِ عام پر آ کر ادبی حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ''رنگ تحریر'' اور ''تبصروں کی بہار'' زیرِ طبع ہیں۔

مجموعہ ''غبارِ خاطر'' میں 1977ء سے 1982ء کے درمیان لکھے ہوئے انشایئے شامل کئے گئے ہیں۔ جو روزنامہ 'سلامتی'، 'سالار'، 'شگوفہ' اور 'شاعر' گلبرگہ، بنگلور، حیدرآباد، ممبئی اور دو ماہی 'ظرافت'، سہ ماہی کرناٹک اردو اکاڈمی کے ترجمان ''اذکار'' میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آج کل، پروازِ ادب، تعمیر ہریانہ، امکان، آہنگ، فیصل، تخلیق نو کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ سے بھی قارئین اور سامعین کو محظوظ کرتے رہے۔

مجموعہ ''آنکھ بیتی'' 2009ء میں شائع ہوا۔ یہ بائیس مضامین پر مشتمل ہے۔ مجموعہ ''صرفِ درباں'' 2012ء میں شائع ہوا اور اس میں چودہ مضامین شامل ہیں۔

گلبرگہ شہر کو ایک ادبی مقام حاصل ہے۔ اس شہر میں آنے کے بعد رؤف خوشتر کے لیے بھی یہ ماحول سازگار ثابت ہوا اور انھیں ایک اچھا انشاء نگار بننے میں مدد ملی۔ رؤف خوشتر کی مزاح نگاری کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کرداروں میں تنوع اور ان کے مضامین میں رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی طرح خوشتر کا فن بھی قارئین سے ایک اونچی علمی سطح اور اعلیٰ فہم کا مطالبہ کرتا ہے۔ طنز و مزاح نگاری ایک نازک فن ہے اور قلم کو ذرا سی لغزش ہوئی تو کسی نہ کسی کی دل آزاری کا پہلو نکل آتا ہے۔

رؤف خوشتر اپنے مجموعہ ''آنکھ بیتی'' میں ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے تحت یوں رقم طراز ہیں: ''طنز و مزاح نگار زندگی اور سماج کی منفی صورتِ حال بتلاتے ہوئے بھی بُنیادی طور پر رِجائی رہتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا کتنی حسین ہے۔ یہاں کانٹوں کے ساتھ پھول بھی ہیں۔ جب ایک قنوطی کہتا ہے کہ دنیا کتنی بُری ہے کہ یہاں پھولوں کے ساتھ کانٹے لگے ہوتے ہیں''۔

کسی بھی طنز و مزاح نگار کی تحریروں میں اس کے فن پر دو زاویوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کی تحریر اسلوبیاتی سطح پر کس مقام پر ہے اور دوسرے اس کے موضوعات کس قدر اہم اور متنوع ہیں۔ آیئے ہم رؤف خوشتر کی طنز نگاری کی قدر و قیمت کا پتہ لگانے کی غرض سے ان کے اسلوب اور موضوعات کا جائزہ لیں۔

اُسلوب: رؤف خوشتر کی تحریروں میں سلجھا ہوا اسلوب ملتا ہے۔ زبان کے استعمال پر بھی انھیں دسترس حاصل ہے۔ وہ پورے اعتماد اور سہولت کے ساتھ واقعات میں شگفتہ کاری کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے موجودہ دور کو در پیش مسائل و مشکلات کو نہایت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کہیں ان کی بتائی ہوئی تصویریں طنز سے بھرپور ہیں تو کہیں انھوں نے افراد کے مضحک خاکے اڑائے ہیں۔ انھوں نے ہمارے معاشرے کے نام نہاد اشخاص پر نہایت بصیرت افروز ریمارک کئے۔ انھیں کردار نگاری میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ یہ ان کا دل پسند موضوع ہے۔ کسی بھی کردار کا خوشتر دلچسپ ترین حُلیہ بیان کرنے میں خاص دسترس رکھتے ہیں۔

مجموعہ ''غبارِ حاضر'' میں ''منت کش ہوا'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو: ''یہ بات تو اب عام آدمی بھی سمجھ رہا ہے کہ کیوں کوئی وزیر بن کر عوام کو روتا بلکتا چھوڑ کر بیرونی ممالک کے طوفانی دورہ پر نکل پڑتا ہے۔ انھیں ملک کے سلگتے مسائل، جھلستے دیہات، اُگلتے حزبِ مخالف، مزدوروں کی گرما گرم ہڑتالیں اور سب سے بڑھ کر یہاں کی گرم آب و ہوا کا بخوبی اندازہ ہے۔ اب یہ بچارے تھکے ماندے قوم کے خدمت گار کچھ دن باہر آرام کر لیں تو ملک میں کون سی قیامت آ جائے گی''۔

مجموعہ ''غبارِ حاضر'' کے ایک مضمون ''چاندنی چوک'' میں گنجے پن پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''گنجے برادری اپنے آمدنی کا بیشتر حصہ بالوں کی افزائش اور کھوپڑی پر نو آبادکاری پر صرف کرتے ہیں۔ اگر یہی رقومات بنجر زمینوں کی کاشت کے لئے وقف کرتے تو غذائی مسئلہ حل ہو جاتا''۔

آگے کہتے ہیں: ''مغرب کی خوش حالی کا راز شاید اسی میں مضمر ہے کہ وہاں گنجے بکثرت ہیں اس لئے آرائشِ زلف کا وقت بچ جاتا ہے اور یہی وقت وہ تعمیری کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ مشرق میں مرد وزن کا بیشتر وقت آئینہ کے روبرو زلفیں سنوارنے میں گزرتا ہے۔ کاش وہ یہی وقت تقدیر سنوارنے میں صرف کرتے''۔

رؤف خوشتر نے اپنے مضامین میں جہاں دوسروں کا مذاق اڑایا ہے وہیں اپنی ذات کو بھی ہدف بنانے سے گریز نہیں کیا ہے۔ ''آنکھ بیتی'' کے ایک مضمون میں وہ یوں رقم طراز ہیں: ''وہ ہماری آنکھوں پر لگے ہوئے چشمے کا دل کھول

کراورآنکھ مشکل سے کھول کر مذاق اڑاتے ہیں۔کہتے ہیں میاں دنیا کو کھلی آنکھ یعنی چشم عریاں سے دیکھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔دنیا اور تمھاری آنکھوں کے درمیان اب شیشے کی دبیز دیوار آگئی ہے۔شکر ہے دولت کی دیوار نہیں آئی ورنہ تم مجھ کو پہچاننے سے انکار کرتے۔تمھاری چشم گناہ گار اب چشمہ انحصار ہوگئی۔اب تم دنیا کو چشمہ کی نظر سے دیکھ رہے ہو۔اس دور کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ نقطہ نظر جسے وہ اپنا کہتا ہے اِس کا نہ ہوکر رہینِ ستم ہائے غیر کا ہوکر رہ گیا ہے''۔

رؤف خوشتر نے ہمارے اطراف بکھری ہوئی انسانی رشتوں کی لاتعداد بے ہنگم تصویریں پیش کی ہیں۔ان میں شدید صدائے احتجاج بھی ہے اور بیہودہ رسم ورواج پر نشتر زنی بھی۔الفاظ کی بازی گری نے ان جملوں میں مفاہیم کے نئے دروا کیے ہیں اور کہنے کا انداز ایسا کہ قاری ہنسی ہنسی میں ان کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔مضمون ''دیدہ بینا'' کی یہ عبارات ملاحظہ ہوں:''اپنے مختصر دورِ عروج کی بنا پر طوائف اور سیاست داں ایک کشتی میں سوار ہیں اس لیے اگر اول الذکر اپنی اداؤں پر اور آخر الذکر حسین وعدوں سے سادہ لوح انسانوں کی چاہت اور دولت لوٹ رہے ہیں تو کیا برا ہے۔طوائف شباب دکھلا کر نوٹ اور سیاست داں خواب دکھلا کر ووٹ حاصل کرتے ہیں۔فی زمانہ نوٹ اور ووٹ کا بہت قریبی رشتہ رہا ہے۔عصری جمہوریت کے یہ دو پہیے ہیں۔''

بعض منچلے اور باریک بیں نامہ نگار یہ سوال کر بیٹھتے ہیں کہ ''حسینائیں کاجل اور سیاست داں گاگل (سیاہ چشمہ) سے آراستہ کیوں ہوتے ہیں''۔اب انھیں کون سمجھائے کہ کاجل سے لوٹنے اور گاگل سے چھپنے کا کام لیا جاتا ہے۔''

بار بار خوشتر نے اپنی نوکِ قلم سے خواب خرگوش میں پڑے ہوئے بے حس معاشرے کو جھنجھوڑنے کا فریضہ ادا کیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:''امریکہ کا صدر گورا ہو یا کالا ہے تو اسرائیل کا سالا۔جو قوم کو حلیم بننے کی تلقین کی گئی تھی وہ قوم حلیم بننے کی بجائے حلیم بنانے اور کھانے میں مصروف ہوگئی۔''

خوشتر نے نئے نئے طریقوں سے ہمارے سماجی ناسور مثلاً جہیز کی رسم،انسانی رشتوں کی پامالی،جھوٹی امارت اور نمائشی طور طریقوں کا کچا چٹھا کھولنے میں بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ان کے پسندیدہ موضوعات میں مطلب پرست لوگوں،دوست نما دشمنوں،موقع پرستوں،مذہبی منافرت پھیلانے والے سماجی ٹھیکہ داروں اور جدید تہذیب میں رنگے ہوئے گرگٹوں،مغربی تہذیب پر مر مٹنے والے نوجوانوں اور ہر طرح کی غیر مہذب غیر اخلاقی سرگرمیوں میں مبتلا تعلیم یافتہ افراد کی غیر مہذب سرگرمیوں کو آپ نے نوکِ قلم پر رکھ لیا ہے۔مثال کے طور پر ''آتشِ ڈوزخ میں یہ....کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:''خورشید کسی جوان بیوہ کی ظالم ساس کی طرح پھر آگ برسا رہا تھا۔اسے جب چراغ پا دیکھتا ہوں تو جسم سے پسینے کی دھاریں بہنے لگتی ہیں۔آنکھیں موند کر (میں اسے دیکھوں؟ بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے) پوچھتا ہوں:۔''سنا ہے تم یورپ امریکہ میں زن مرید کی طرح ٹھنڈے مزاج کا مظاہرہ کرتے ہو۔پھر ایشیا اور افریقہ پر تمہارے قہر وغضب کا عذاب کیوں نازل ہوتا ہے؟ کہیں اوروں کی طرح تم بھی نسلی تعصب کا شکار تو نہیں؟''

''مغرب میں عریانی اور اخلاقی گراوٹ دیکھ دیکھ کر شرم سی محسوس ہونے لگی ہے۔اس لیے وہاں اپنا چہرہ پوشیدہ رکھتا ہوں۔مشرق میں تپتے اور جھلستے چہروں پر شرم کی لالی اور امید کی کرن جھلملاتی نظر آتی ہے۔اس لیے یہاں گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا ہوں''

عالمِ خیال میں سورج کا یہ شمسی استدلال سن کر ہم بھی اس کے معترف ہوگئے اور یہ بات روشن ہوگئی کہ کیوں لوگ چڑھتے سورج کے آگے جھکتے ہیں''۔

آگے کہتے ہیں:''یکا یک صاحبِ بوتل نے تخلیہ کا نعرہ بلند کیا۔ہمارے اخراج کے بعد انھوں نے کمرہ بند کر لیا۔اندر سے چٹاخ چٹاخ کی پیہم صدائیں کانوں سے ہوتی ہوئی معدہ میں گشت کر رہی تھیں۔دروازہ کھلنے پر اُن کے سُرخ ہونٹوں کو دیکھ کر میر تقی میرؔ اپنی پنکھڑی گلاب والی غزل سمیت یاد آئے''۔

ریاست کرناٹک کے بیشتر طنز ومزاح نگاروں کے برعکس رؤف خوشتر کی تحریروں کو اگر ہم صنفیہ حوالے سے تجزیہ کرنا چاہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی کم وبیش ہر تحریر،مضمون،افسانے اور انشائیے کے دوراہے پر کھڑی دکھائی دیتی ہے۔اکثر تحریروں میں مضمون اور افسانے کا عُنصر ذرا کم ہے تو انشائیے کی چھاپ گہری اور نمایاں ملتی ہے۔بات سے بات پیدا کرنے کا انداز،الفاظ کا اُلٹ پھیر اور اشعار کو نثر کرتے ہوئے ان کا دلکش استعمال کہ پڑھنے والے کو ایک خاص لطف وانبساط عطا کرتا ہے۔اِن کے لئے موضوع کی قید نہیں،وہ کسی موضوع کے بغیر بھی قلم چلاتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ وہ نہایت بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھے باتوں کا سلسلہ در سلسلہ چلاتے ہوئے اس کا انبار لگا رہے ہیں۔ایک اور خاص بات ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے کہ انھوں نے ہر چیز کو چیزے دیگر بنا دیا ہے۔یعنی کہ وہ ہر چیز کو ایک نئے زاویہ سے دیکھنے اور دکھلانے کا انسانی درک رکھتے ہیں جس سے طنز وظرافت کی لازوال کرنیں ایک خاص سماں پیدا کر دیتی ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:

''مرزا غالب کے تعلقات جمّن (نوکر) سے برائے جام،ڈُومنی سے برائے شام،بہادر شاہ ظفر سے برائے آم،ساہوکار سے برائے دام،انگریزوں سے برائے کام اور مولویوں سے برائے نام تھے۔ہمارے انجینئر چائے پان کے،اصل انجینئر جاپان کے''۔

سیاست اور سیاست دان،انسانی نفسیات اور جو دِزن،بیوی یعنی نصف بہتر،ان کے نہایت مرغوب موضوعات ہیں۔''آنکھ بیتی'' کے ایک مضمون ''ہمارا زمانہ'' میں کس طرح خامہ فرسائی کی ہے ملاحظہ ہو:''ایک دن دیکھا کہ دفتر ''زمانہ'' پر دنیا بھر کے لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔وائے حیرت کہ کیا ایسے بھی دن دیکھنے کو نصیب ہوئے کہ اردو قاری اخبار خرید کر پڑھ رہے ہیں۔اس حیرت انگیز انقلاب کا سہرا صاحبِ ''زمانہ'' کے سر باندھنا ہی چاہتے تھے کہ اندر سے زنانہ آواز آئی۔لپک کر اندر پہنچے تو دیکھا کہ خوش پوش شکل خاتون بوم الدولہ پر برس رہی ہیں۔

بہ دقت تمام ہم نے خاتون کو ان کی بچی ہوئی گالیوں کے ساتھ رخصت کیا کہ کچھ گالیاں شوہر کے لئے بچائے رکھیے،پھر صاحبِ ''زمانہ'' سے عذابِ زنانہ کا قصہ

پوچھا تو کہنے لگے۔ ”میں کیا جانوں، وہ اخبار لینے آئیں اور آتے ہی برس پڑیں کہ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ آپ نے کیا سمجھ کر اشتہار چھاپا ہے“۔

ہم نے اخبار دیکھا گلشن اینڈ کمپنی کا اشتہار تھا کہ ہمارے پاس ہر قسم کا مال مناسب دام پر ملتا ہے۔ پھر حسب روایت وشرارت بوم الدولہ نے اس اشتہار کی سُرخی یوں باندھی: چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

معلوم ہوا کہ اس خاتون کا نام گلشن ہے۔ اور یوں اخبار ”زمانہ“ ہفتہ عشرہ سے بند ہے۔

مجموعہ ”غبار حاضر“ کا مضمون ”منت کشِ ہوا“ ملاحظہ ہو: ”نظامِ فلکیات میں ان کی دخل اندازی پر عش عش کر اُٹھے۔ خوشگوار اور دلکش منظر کے شوق میں آگے بڑھے تو دو چار کتوں کو عدیم الفرصت سیاست دانوں کی طرح محو بحث پایا۔ قریب جانے پر علم ہوا کہ عظیم سیاسی حریفوں کی طرح آپس میں غرا رہے ہیں۔ ہماری آمد پر وہ چونک اُٹھے۔ بدلتی ہوئی سیاسی وفاداری کی طرح فوراً ان کی غراہٹ ہماری طرف منتقل ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ہم نے دو چار قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ ”اے معزز کتو! ہمیں تمھاری اس تقریب سے کچھ سروکار نہیں۔ اس غلط وقت پر گھر سے بے گھر ہونے میں کچھ راز ہے اس لئے: مجھ کو مت کاٹیو موہے پرموشن کی ہے آس

کہہ کر عدم تشدد بھرا آداب بجالاتے ہوئے کھسک گئے۔

لیکن مرزا پر سگ فہمی کا خبط سوار تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے کہ ”جو بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں“ آگے بڑھے۔ کتے مرزا کو بن بلائے مہمان سمجھ کر حملہ کر بیٹھے۔ ایک نے پیر پکڑا، دوسرا پیرہن اُتارنے لگا، مرزا اب چچا ڈارون کی تھیوری کا جیتا جاگتا اُچھلتا کودتا شاہکار معلوم ہونے لگے۔ ہم حسبِ عادت بھاگ کھڑے ہوئے۔ مرزا بدحواس پیچھے دوڑتے آرہے تھے۔

اگلے موڑ پر دو پولیس والے جوان نمودار ہوئے۔ اس سے پہلے کہ مرزا کچھ کہتے ان کو جیپ میں بٹھا کر تھانہ لے گئے۔ ہم نے سوچا کتوں میں ہی بھلے تھے۔ کتے تو کپڑا اُتارنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ بھلا پولیس والے چمڑی اتارے بغیر رہتے ہیں“؟

ان کی تحریروں میں انشائیے کے ساتھ نہایت دلچسپ آپ بیتی جیسا انداز بھی دکھائی دیتا ہے۔ جہاں انھوں نے اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے ہوئے مختلف معاشرتی موضوعات پر مسکراتی ہوئی نگاہ ڈالی ہے۔ مجموعہ ”غبارِ حاضر“ کا ایک مضمون ”سرچشمہ“ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے: ”اے، بی۔ اے، بی۔ رٹتے ہوئے ہم بی۔ اے ہوئے تو معلوم ہوا کہ ملازمت کے سارے دروازے بند ہوگئے ہیں۔ لیکن یونیورسٹی کے دروازے حزب مخالف کے دہن کی طرح کھلے تھے۔ ہم نے جوں توں کر کے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ اور سچ مانیے ہم امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوگئے۔ شکر ہے موجودہ ریلوں کی طرح یونیورسٹیوں سے بھی درجہ سوم غائب ہوتا جارہا ہے۔ لگتا ہے ماہرین تعلیم اور اربابِ ریلوے کی میٹنگ ایک ہی اسٹیشن پر ہوئی ہوگی اور وہ اسٹیشن یقیناً ہِل اسٹیشن ہوگا۔ میٹنگ، کانفرنس یا کمیشن کی کامیابی اور گرما گرم بحث کے لئے صحت افزا مقام کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔

ایم۔ اے کے بعد پھر ملازمت کا مسئلہ درپیش آیا۔ معلوم ہوا کہ مقامی کالج میں ہنوز ایک جائیداد خالی ہے۔ سالے صاحب کے سالے ڈپٹی منسٹر ہیں۔ فوراً ہم نے سالے صاحب کو بیوی بچوں کے مستقبل کا خیال کئے بغیر ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام کر ڈالا۔“

اپنے ہم عصر لکھنے والوں کی جھرمٹ میں رؤف خوشتر اپنی انفرادی پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی طنزیہ ومزاحیہ تحریروں میں سادگی، پرکاری کے ساتھ ساتھ سماجی کمٹمنٹ (commitment) نے زندگی کی مضحکہ خیزی پر خندہ زن ہونے کا سلیقہ فراہم کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رؤف خوشتر اپنے عہد کے بسیار نویس طنز ومزاح نگار کہلائے جاسکتے ہیں۔ ان کی کائناتِ مزاح پر ایک قصہ گو کی حکمرانی ہے، جو مزاح کی مست سلطنت کی تشکیل کرنے میں ہمہ وقت مصروفِ کار ہے۔ الفاظ کے برمحل و برجستہ استعمال میں وہ کامیاب ہیں۔ وہ اشعار ومحاوراتی تصرفات کرتے ہوئے معنی کی نئی جہتوں کو کھولتے جاتے ہیں۔ اسلوب میں تہہ داری پیدا کرنے کے لئے انھوں نے محاوروں کے لفظی اُلٹ پھیر سے بہت خوب کام لیا ہے۔ ان کا ایک مضمون ”گھر واپسی“ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”پھر وثوق سے کہتے ہیں کہ میں تو جنت میں ہی جاؤں گا۔ پوچھنے پر ان کا منظوم جواب کچھ یوں ہوتا ہے۔

بروز حشر میں بے خوف گھس جاؤں گا جنت میں
وہاں سے آئے تھے آدم وہ میرے باپ کا گھر ہے

اور فرشتے جنت میں اس شاعر کی شور پسندی سے گھبرا کر چپکے چپکے آنسو بہا کر کہتے ہوں گے کہ ؎ ہم کو اب تک خاموشی کا وہ زمانہ یاد ہے

ظاہر ہے یہ ہوشیار شاعر معصوم فرشتوں کو قائل کرتے ہوئے یقین دلاتے ہوں گے کہ میاں جنت میں میرا داخلہ کچھ اور نہیں میری گھر واپسی ہی تو ہے۔“

رؤف خوشتر نے روزمرہ کی زندگی سے تمام واقعات کا انتخاب کیا ہے اور ان میں قصہ گوئی کا عنصر داخل کرتے ہویے واقعات عصر آور بنا دیا ہے۔ اپنی باریک بینی اور عمیق مشاہدے کو بروئے کار لاتے ہویے نت نئی تشبیہیں پیش کرتے جاتے ہیں اور لطف میں اضافہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اظہار کے تمام پیرایوں سے بخوبی واقف ہیں۔ بعض جگہ ذومعنی الفاظ سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں کسی جملہ یا لفظ کو معنوی اختلاف کے باوجود مکرر استعمال کرتے ہویے اس لفظ کی معنی جہتوں کو پوری طرح کھول کر ایک نیا جہان آباد کیا ہے۔ تحریف نگاری ادبی مزاح کا ایک اچھوتا اور پاکیزہ پیرایہ ہوا کرتا ہے اور قاری کو بے حد محظوظ کرتا ہے۔ خوشتر کی تحریروں کا سب سے اہم پہلو اندازِ بیان اور خوشگوار اسلوب اور ڈکشن کا عمدہ جائزہ ہے۔ ان کی گلفشانی دیکھنی ہو تو ان کے مضامین پڑھتے ہویے قاری کی نظر ٹھہر ٹھہر جاتی ہے۔ ان کی تحریریں صرف اپنے مواد کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اپنے اندازِ بیان کی وجہ سے بھی کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

غـــــــزلیـــــــات

ڈاکٹر اسلم حنیف

P.O:Gunnaur.DT:Sambhal-243922(U.P)
Mob-9997429226

ہے خوابناک خموشی سی کہکشاں گم ہے
وہ فکر کیا ہے مری طرح آسماں گم ہے
جو پڑھ سکو تو پڑھو اک محل کے ملبے کو
قدم قدم پہ یہاں ایک داستاں گم ہے
ہوائے تیز قدم مائل سفر بھی نہیں
یہ کیسا ذہن میں پھر شورِ سائباں گم ہے
ہے زندگی میں سراغِ ثبات ناممکن
مرے ضمیر میں اک موجِ بیکراں گم ہے
ملا ہے ٹوٹ کے ظاہر میں میہمانوں سے
مگر درونِ تصور تو میزباں گم ہے
وہی ہے دشت وہی تیز تر شعاعیں ہیں
برس رہا ہے زرِ سرخ ساربان گم ہے
پلک جھپکتے ہی نیند آگئی تو کیا ہوگا
ہماری پتلی میں اک خوابِ بیکراں گم ہے

ڈاکٹر مسعود جعفری

No.8-1-43/1/A/5
Satya Colony.Shaikhped
Hyderabad-500008

ہم اس کے ساتھ ساتھ سر شام ہو لیے
ایسا چلے کہ صبح کا تارا بھی کھو لیے
ایسا لگا کہ لوریاں دینے لگی ہے ماں
راہِ سفر میں نیم کے سائے میں سو لیے
کب تک رہیں گی آپ کے لب پر خموشیاں
اللہ میاں ہیں آپ تو کچھ ہم سے بولیے
لمبے سفر کا انت کہاں تھا پتہ نہیں
دریا میں گہری نیند کے خود کو ڈبو لیے
جنگل کی سائیں سائیں بھی ڈسنے لگی ہمیں
آنسو کی بوند بوند سے چہرہ بھگو لیے
ایسا لگا کہ برقِ تپاں دوڑنے لگی
چپکے سے ہم نے اس کے ذرا ہاتھ چھو لیے
بن باس میں مزہ بھی تو آیا ہے جعفری
عورت کا بوجھ پیار سے ہنس ہنس کے ڈھو لیے

پی۔پی سریواستو رند

R-16,SEctor-xi,Noida-201301
Mob-9711422058

منتشر تہذیب نے قصہ لکھا
آنے والی نسل پر قرضہ لکھا
جس کو دھرتی ماں کہا کرتے تھے ہم
شہر والوں نے اسے رقبہ لکھا
ہجر رُت میں ایک کالی داس نے
ابر کے ٹکڑوں پہ سندیسہ لکھا
عید اور ہولی ملن کی بھیڑ کو
پستہ قد لوگوں نے ہنگامہ لکھا
جگنوؤں سے عشق کرنے کے لیے
کسمساتی رات نے پرچہ لکھا
رند اک گستاخ بچے کی طرح
ضد پہ آکر دھوپ نے سایہ لکھا

مختار احمد کوثر

C-66,Kareli.Allahabad
(U.P)

ملگجی تہذیب کو گنگ و جمن تک لے چلو
اپنی دھرتی کو بلندی کے گگن تک لے چلو
بوجھ بن کر رہ گئی ہے آنکھ پر عریانیت
اس نئی تہذیب کو رسمِ کہن تک لے چلو
خود بخود کھل جائے گا یہ زندگی کا فلسفہ
اپنے احساسات کو گور و کفن تک لے چلو
مسئلے مظلوم کے طالب بھی ہیں حقدار بھی
ان کے دل کے درد کو شعر و سخن تک لے چلو
گھات میں کب سے لگی ہے یہ تعصب کی خزاں
اپنے پھولوں کو بہارِ گلبدن تک لے چلو
چھوڑ کر کوثر لب و رخسار کی یہ شاعری
خامۂ بیباک کو دار و رسن تک لے چلو

ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی

Mlngua.Napal-45800
Mob-8229055737

تری چاہت میں رسوائی بہت ہے
یہ تھوڑی سی شناسائی بہت ہے
ٹھہر جاتی ہے کیوں آکر قیامت
ابھی دنیا میں اچھائی بہت ہے
کسی زاہد کی توبہ توڑنے کو
تری بس ایک انگڑائی بہت ہے
ابھی غالب نہیں ہے جھوٹ اتنا
ابھی لوگوں میں سچائی بہت ہے
ہیں سب موجود لیکن تم نہیں جب
''بھری محفل میں تنہائی بہت ہے''
بطونِ لفظ میں دیکھو اتر کر
مری غزلوں میں گہرائی بہت ہے
وصی ہم پیار کرکے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس میں کٹھنائی بہت ہے

کرشن پرویز

Kharar.Dt:Mohali-140301(Punjab)
Mob-9872628168
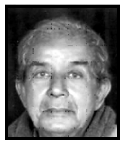
دیش کا بگڑا ہے کچھ ایسا نظام
ہو گیے چھوٹے بڑے سب بے لگام
پچھلی قدروں کو تو بھولے ہیں سبھی
ہو گیے تہذیبِ نو کے سب غلام
گفتگو میں ہے تکبر اور غرور
ہر طرف نفرت کدورت ملتی عام
توڑتے ہیں روز سب قانون کو
اب کہاں قانون کا ہے احترام
پیار الفت سارے پیچھے رہ گیے
اس قدر دنیا ہوئی ہے تیز گام
کہہ رہے پرویز ہم آزاد ہیں
کل تھے گوروں آج کالوں کے غلام

ڈاکٹر مظفر عالم ضیا

Darun Nisahat.Daryapur
Patna-4
Mob-9430558286

سلطان بھی جھکتے تھے درِ گوشہ نشیں پر
ہے آج بھی دنیا کو ضیا فخر انھیں پر
کیوں ہم کو زمانہ یہ مٹانے پہ تلا ہے
ہم حرفِ مکرر تو نہیں لوحِ زمیں پر
ہے اوج پہ اب ان کے مقدر کا ستارہ
پڑتے ہی نہیں ان کے قدم اب تو زمیں پر
دنیا نے نظر پھیر لی ہم سے تو نہیں غم
اپنا تو بھروسہ ہے فقط عرش نشیں پر
اجداد میں جو جذبۂ ایثار و وفا تھا
ہم میں تو نظر آتی نہیں ہے وہ کہیں پر
آتا ہے ضیا سامنے قسمت کا لکھا ہی
ورنہ ہے خبر کس کو ہے کیا نقش جبیں پر

ظفر اقبال ظفر

170-Kheldar.Ftehpur-212601(U.P)

زندگی بھر ریت پر چلتا ہوا
کب سمندر سے مرا رشتہ ہوا
زخم کتنے وقت نے ہم کو دیے
آئینہ دیکھا تو اندازہ ہوا
مت کرو بیدار اس کو نیند سے
آدمی ہے خواب سے بہلا ہوا
دل مرا ٹوٹا ہے اس کی بات سے
پوچھتے ہیں لوگ مجھ سے کیا ہوا
گرد چہرے پر مسافت کی لیے
آگیا ہے وہ سفر کرتا ہوا
بم کی بارش ہو رہی ہے ہر طرف
آدمی اپنے سے ہے سہما ہوا
کٹ رہی ہے ڈور رشتوں کی ظفر
آج انسانوں کو آخر کیا ہوا

عبدالمجید فیضی

12/106,Nayapara
Sambalpur-768001(Odisha)
Mob-977825038

چاند تاروں اور سورج سے منور دوستو!
میری دنیا میری جنت میرا ہے گھر دوستو!
ہوتے ہیں سیراب پیہم تشنہ کامانِ ہنر
موجزن ہے علم و حکمت کا سمندر دوستو!
میکشوں کے واسطے سامانِ ناؤ نوش ہے
عام ہے پینا پلانا اب تو گھر گھر دوستو
ننھے بچوں، بوڑھے، مرد و زن کا خوں ہوتا ہے روز
خونِ ناحق کو جہاد اب کہیے کیوں کر دوستو!
بن گیا فتنہ فساد اب کیسے اسلامی جہاد
دشمنِ اسلام ہیں یہ فتنہ پرور دوستو!
کیسے کیسوں کو کیا ہے انقلابِ وقت نے
رہ نشیں، بے برگ و بار و خاک برسر دوستو!
اہلِ حق سے اکتسابِ فیض کا حاصل ہے یہ
دامنِ فیضی میں ہیں جو لعل و گوہر دوستو!

نادر اسلوبی

H.No:6-5-6,Hanamkunda
Warangal-506011(T.S)

فکر گر بہ اندازِ شاعری نہیں ہوگی
شاعری کے گوشے میں روشنی نہیں ہوگی
غم کو میرے وہ اکثر بانٹ کر گزرتی ہے
جو ادھر سے گزری ہے زندگی نہیں ہوگی
آپ کے حریفوں کے درمیان میں بھی تھا
طے یہی ہوا ہے جیت آپ کی نہیں ہوگی
اور پھول آئیں گے جو چمن سلامت ہو
اک مرے بکھرنے سے کچھ کمی نہیں ہوگی
آپ کی خموشی اب مجھ کو بھی جو لے ڈوبے
دور دور تک میری کیا ہنسی نہیں ہوگی
بات صاف ہے پھر بھی آپ نے نہیں سمجھی
نوکری نہیں تو پھر زندگی نہیں ہوگی
فن کی گہری وادی سے نادر اس بلندی تک
ایسا لگتا ہے تم نے سانس لی نہیں ہوگی

عبدالشکور پروانہ

Islampur.NearGausia
Masid.P.O:Makhdumpur
Dt:BOKARO(Jharkhand)

خوف و دہشت کی تلوار ہر موڑ پر
زندگی اب ہے بیزار ہر موڑ پر
ایک بیوہ کا بیٹا کیا مارا گیا
گرم سارا ہے بازار ہر موڑ پر
آج کل شام کا ہے نظارا عجب
مست ملتے ہیں دوچار ہر موڑ پر
آج مہر و مروت کا تہذیب کا
ہے جنازہ مرے یار ہر موڑ پر
حادثوں کے گزر جانے کے بعد ہی
چست ہوتی ہے سرکار ہر موڑ پر
ذکر دنیا کا پروانہ میں کیا کروں
ہیں تباہی کے آثار ہر موڑ پر

گوہر جمالی

Opp:RagniMicroPhone.Chota
AshokNagar.P:O.Gudhiyara
Raipur-492009(C.G)

عزیزِ قلب و نظر جس کا بن گیا ہوں میں
اسی کے قتل کی سازش بھی کر رہا ہوں میں
قدم قدم پہ یہ احساسِ سرفرازی ہے
کسی کی ذات سے وابستہ ہو گیا ہوں میں
بہت سنبھال کے رکھنا ہوا کے جھونکوں سے
سیاہ رات میں جلتا ہوا دیا ہوں میں
نہیں ہے آج مجھے کوئی خوفِ غرقابی
جنونِ شوق میں دریا پہ چل رہا ہوں میں
کمالِ عشق نہیں ہے تو ماجرا کیا ہے
وہ دیکھتا ہے مجھے اس کو دیکھتا ہوں میں
یہ اور بات کہ لب پر نہ آ سکا گوہر
مگر یہ سچ ہے اسے دل سے چاہتا ہوں میں

محمد باعشن مغموم
2ndFloor.4-PrincepStreet
Kolkata-700072

اندھیرا میرے رستے کو کبھی جب ڈھانپ جاتا ہے
مجھے لگتا ہے جیسے ہر قدم پر سانپ جاتا ہے
نشیبِ فرش سے کیوں کر فرازِ عرش تک پہنچے
تصور آپ تک جانے سے پہلے ہانپ جاتا ہے
زمانہ ظلم کرتا ہے محبت خام ہے جب تک
محبت پختہ ہو جس دم زمانہ کانپ جاتا ہے
تغافل کی نمائش سے حقیقت چھپ نہیں سکتی
حقیقت بھانپنے والا حقیقت بھانپ جاتا ہے
سہارا دینے والے تیرے آنچل کا خدا حافظ
مرے نزدیک آ کر ہر سہارا ہانپ جاتا ہے
الٰہی کتنی بے رحمی سے گلچیں توڑ لیتا ہے
مآلِ غنچۂ نورس پہ یہ دل کانپ جاتا ہے

شفیق رائے پوری
NearHeadPostOffice.Beside
CentralBank Of India.Indira
Ward.Jagdalpur-494001(C.G)

جو قید اپنی ذات کی تنہائیوں میں تھا
وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ گہرائیوں میں تھا
اک مہرِ نیم روز تھا اک چودھویں کا چاند
کس درجہ اختلاف میرے بھائیوں میں تھا
میں یوں صراطِ کرب سے ہنستا گزر گیا
تیرا خیال حوصلہ افزائیوں میں تھا
خود مطلبی کے راگ نے بے لطف کر دیا
ورنہ مزا خلوص کی شہنائیوں میں تھا
اب کیا کریں کہ دل پہ لگا ہو کسی کا زخم
نشتر ہماری باتوں کی سچائیوں میں تھا
حالانکہ خود شفیقؔ بکھرتا چلا گیا
مصروف پھر بھی انجمن آرائیوں میں تھا

مرغوب اثر فاطمی
Road No-7,Moh: Aliganj
Gaya-823001(Bihar)

دیکھا اُسے تو ٹوٹ چکا، پائمال تھا
خود ساختہ فصیل کا وہ یرغمال تھا
میرا ضمیر آنکھ دکھانے لگا مجھے
ہوں کون؟ اپنے آپ سے میرا سوال تھا
جشنِ صفاتِ ذات میں دیکھا جو جھانک کر
خود آگہی کا چہرہ متانت سے لال تھا
ذوقِ دُرون بینی پہ قربان جایئے
دل مضطرب تھا شوق کے شیشے میں بال تھا
انسانیت کے جسد کی تدفین میں شریک
ہر کوئی پارسائی کی عمدہ مثال تھا
یوں کر کے دیکھتے ہیں یہ خصلت ہے آج تک
روزِ ازل بھی اپنا یہ پہلا خیال تھا
یہ کیا ستم ظریفی ہے، شاعر کو کیا ہوا!
وہ تو اثرؔ امینِ جمال و کمال تھا

حیدر مظہری
KolBazar.Bilari-583103(Karnataka)
Mob-9844428175

دیکھنا حل جہاں سے نکلے گا
ایک فتنہ وہاں سے نکلے گا
لوگ سینہ سپر تو ہیں لیکن
خوف بھی درمیاں سے نکلے گا
علم کس کو فریب کی صورت
کون، کب اور کہاں سے نکلے گا
ان پری زادیوں کے جھرمٹ میں
دیو بھی آسماں سے نکلے گا
لوگ خوش ہیں تصورات میں سب
کون دارالاماں سے نکلے گا
چین آیے گا ایک خطرہ جب
ہر دلِ شادماں سے نکلے گا
ضبط کا پاس گر نہ ہو حیدر
شور اک اک مکاں سے نکلے گا

شارق ریاض
9/A,PatwaParaLane
Kolkata-700011(W.B)
MOb-9088561437

دردِ دل جب کوئی سناتا ہے
اپنا غم مجھ کو یاد آتا ہے
جب وہ میرے قریب آتا ہے
وقت جیسے ٹھہر سا جاتا ہے
راہ چلنا جسے نہیں آتا
وہ مجھے راستہ دکھاتا ہے
ہے سبھی کچھ خدا کے ہاتھوں میں
مارتا ہے وہی جلاتا ہے
بہتے دھاروں کا حوصلہ دیکھو
پتھروں میں جگہ بناتا ہے
میری آنکھوں کو کیا ہوا آخر
نیند آئی نہ خواب آتا ہے
اس کا رونا فریب ہے شارق
روز قصہ نیا سناتا ہے

بدر محمدی
ChandpurFateh.P.O:Baryarpur
Dist:Vaishali-843102
Mob-9939311612

دل جو دل سے قریب ہوجایے
زندگی خوش نصیب ہوجایے
کہتے ہیں سب مسیحِ وقت اسے
جو فدائے صلیب ہوجایے
دل رہِ راست پر نہیں آتا
عقل چاہے خطیب ہوجایے
یوں میں آواز دے رہا ہوں اسے
جیسے کوئی نقیب ہوجایے
حالِ گلشن بیان ہو کیسے
چپ اگر عندلیب ہو جایے
ایسی کوشش ہے اس کی مشقِ سخن
بدرؔ جیسے ادیب ہوجایے

ہارون فراق
Maz Dadaji netra Hospital
Khandwa(M.P)

خود کو سمجھ نہ پایا، کہ مجبور ہے فراق
اپنی پہنچ سے دور بہت دور ہے فراق
کس سے ملیں یہاں پہ کریں کس سے بات ہم
ہر کوئی اپنے آپ میں مسرور ہے فراق
روشن اُسی کے دم سے ہے یہ ساری کائنات
میرے نبیؐ کا نور علیٰ نور ہے فراق
چاہے کوئی تو کوششیں کر کے بھی دیکھ لے
ہوگا وہی، خدا کو جو منظور ہے فراق
سچّا ہمارے گاؤں کا ہے آج بھی رواج
جھوٹا تمہارے شہر کا دستور ہے فراق
کوئی کسی کے غم میں ہے مبتلا فراق
کوئی نشے میں اپنے یہاں چور ہے فراق

قیصر امام قیصر
Grand Fashion, Quraishi Market, B.B.C Road,
Gridih-815301(Jharkhand)
Mob: 9570187853

بدن چھلنی ہے تیروں سے مگر ایسا نہیں کرتے
رحم کی بھیک ظالم سے کبھی مانگا نہیں کرتے
ملا ہے حضرتِ شبیر سے یہ حوصلہ ہم کو
حکومت بھی مخالف ہو تو ہم پروا نہیں کرتے
ابھی ایماں سلامت ہے ہمارا دورِ پستی میں
کسی زردار کی چوکھٹ پہ ہم سجدہ نہیں کرتے
خدا محفوظ رکھتا ہے بلا سے اور مصیبت سے
"نمازیں پڑھنے والے عمر بھر یوگا نہیں کرتے"
دعائیں ان کی رہتی ہیں خلاؤں میں معلق ہی
وسیلے سے دعائیں جو کبھی مانگا نہیں کرتے
ہنر اجداد نے ہم کو سکھایا ہے یہی قیصر
سرِ محفل کسی کو ہم کبھی رسوا نہیں کرتے

مظہر محی الدین
C/o. Ismail Panwale, 3rd Cross,
9-7-680,Near Mahanthaliya School
B.T.PatilNagar,KOPPAL-583231(K.S)
Mob-8448326670

زندگی کو فنا نہیں ہے کیا
پھر فنا کو بقا نہیں ہے کیا
گلشنِ زندگی کا شیرازہ
پارہ پارہ ہوا نہیں ہے کیا
حرفِ اقراء ازل سے تا بہ ابد
نسخۂ کیمیا نہیں ہے کیا
مجھ سے بہتر ہے کون دنیا میں
ہر کوئی سوچتا نہیں ہے کیا
تیرا ہر وار حرفِ روشن پر
سچ بتا بے خطا نہیں ہے کیا
شعر گوئی بھی حرفِ روشن میں
صدقۂ جاریہ نہیں ہے کیا
تا قیامت کلام حق مظہر
ایک روشن دیا نہیں ہے کیا

سید آصف دسنوی
C-12,Sec-6.C.D.A Colony
Bidanasi.Cuttack-753014

ہم نے سب کچھ کھو کے سمجھا زندگی ہوتی ہے کیا
التفاتِ دوست کیا ہے، بے رخی ہوتی ہے کیا
روز و شب میں رکھ دیے اس نے رموزِ آگہی
روشنی کہتے ہیں کس کو، تیرگی ہوتی ہے کیا
دیکھ کر وارفتگی میں اس کو وحشت نے کہا
حسن کہتے ہیں کسے اور عاشقی ہوتی ہے کیا
لب پہ اس کا نام آصف دل میں ہو اس کی تڑپ
سر جھکا کر دیکھ لو پھر بندگی ہوتی ہے کیا

نیاز جیراجپوری
Editor,Shandar.67-Jalandhari
Azamgarh-276001(U.P)

نیند کی دُشمن یہ میلے والیاں اور چاندنی
سُرخ گھونگھٹ میں چمکتی بالیاں اور چاندنی
بیڑیاں اُمّیدوں کی پہنائیں مجھ کو آج بھی
اِک مکاں کی کھڑکیوں کی جالیاں اور چاندنی
شعلۂ احساسِ تنہائی کو دیتی ہے ہَوا
موسمِ گُل میں تھرکتی ڈالیاں اور چاندنی
میر کے بھی طوطے اُڑ جائیں کبھو جو دیکھ لیں
اُس کے ہاتھوں میں سروتا چھالیاں اور چاندنی
میرے ہونٹوں پر دُعا کے پُھول کھِلتے ہیں نیاز
جب بھی دیکھوں آرتی کی تھالیاں اور چاندنی

جنوں اشرفی
AshrafiHouse.ChhotiKhagol
P.O:Khagol.Ptna-8011050
Mob-8102208187

نذرِ کلیم عاجز

ہوا شوخ چنچل شرارت کرے ہے
قیامت سے پہلے قیامت کرے ہے
کشادہ کبھی تنگ حالت کرے ہے
زبر زیر کی یہ بشارت کرے ہے
حقیقت کہوں تو عدو مجھ کو سمجھے
کہوں جھوٹ گر تو رفاقت کرے ہے
بکھرنے کی دیتا نہیں ہے اجازت
سمٹنے کی کوشش اکارت کرے ہے
امیری نمائش میں دولت اڑائے
غریبی ہماری قناعت کرے ہے
سہولت جنوں ساری میراث اس کی
مرے نام منسوب آفت کرے ہے

ضیاء جعفر
NO:436-94 CROSS
Kumar Swami Layout
Bangalore-580078(KARNATK)

افسانہ

اور منظر بدل گیا........

صبیحہ اپنی پڑوسن سے کہہ رہی تھی ۔''نجمہ' کیا زمانہ آ گیا ہے۔اب لڑکیوں کے لئے لڑکے والوں کو جہیز دینا پڑ رہا ہے۔!!''ہمارے اکلوتے بیٹے جاوید کے لئے کئی رشتے آئے۔مگران کی مانگ دیکھ کر میں دنگ رہ گئی ہوں۔!''

''ہاں بہن تم ٹھیک کہہ رہی ہو''نجمہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔''اب لڑکیوں کا زمانہ ہے۔کیا ڈگریاں حاصل کرلیں اونچی اڑان بھرنے لگیں۔اب سرکار نے بھی سخت قانون بنا دی ہے۔پہلے شادیاں کتنے دھوم دھام سے ہوا کرتی تھیں۔لڑکی والے ڈھیر سارا جہیز دیتے تھے اور لڑکے والوں کے نازنخرے بھی اٹھا لیتے تھے۔اب کیا زمانہ آ گیا ہے''صبیحہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''لڑکی والوں کے کیا مطالبات ہیں؟''نجمہ دریافت کرنے لگی۔

''شادی کے دعوت نامے بہت خوبصورت اور قیمتی ہوں۔لڑکی والے نکاح کی دعوت نہیں کریں گے!ویڈیو گرافی اور اسٹل فوٹو گرافی کی ذمہ داری کسی مشہور اسٹوڈیو کے حوالے کیا جائے''صبیحہ نے انگلیوں پر گننا شروع کیا''۔ولیمہ دھوم دھام سے ہو۔لڑکی کے نام پر بینک میں پانچ لاکھ کی ڈپازٹ کرنی ہوگی۔مہر نکاح سے پہلے زرِ خالص کی شکل میں ادا کرنا ہوگا۔چار،پانچ لاکھ کے زیورات دینا ہوں گے۔براتیوں کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔فضول رسموں سے پرہیز کرنا ہوگا۔لڑکی چونکہ برسرِ روزگار ہے اس لئے وہ چولہا چکی کی جھنجھٹ سے دور رہے گی۔اسی سبب شادی کے بعد گھر میں ملازمہ کا ہونا ضروری ہے۔ملازمہ ادھیڑ عمر کی ہو۔لڑکی اپنی تنخواہ کی مجاز ہوگی۔وہ چاہے تو دلہا میاں سے اپنی تنخواہ شیئر (Share) کرسکتی ہے۔ورنہ زور زبردستی نہیں چلے گی۔البتہ دلہا میاں کو اپنی تنخواہ لاکر دلہن کے ہاتھ میں رکھنا ہوگا۔گھومنے پھرنے کے لئے لڑکا کار خریدے گا۔ان کے علاوہ اور بھی دیگر چھوٹی بڑی فرمائشوں کی لسٹ انھوں نے ہاتھ تھمادی ہے۔

لڑکیوں کے مطالبات سنانے کے لئے صبیحہ کی دس انگلیاں ناکافی تھیں۔

''باپ رے باپ''!نجمہ دم بخود بیٹھی پہلے تو سنتی رہی پھر حیرت سے بولی۔

''گویا شادی کے نام پر لوٹ ہو رہی ہے۔اچھا خاصا بزنس ہے۔میں تو بے موت مر گئی!!''نجمہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''کیوں کیا ہوا''صبیحہ نے حیرت سے سوال کیا۔

''میرے تین لڑکے ہیں''نجمہ نے تھوک نگل کر بتایا۔''ان کی شادیاں ہونے تک ہم بھکاری ہو جائیں گے۔''

صبیحہ نے نجمہ کی پوزیشن پر افسوس ظاہر کیا۔''گویا ہم بھارت میں نہیں عرب ممالک میں ہیں جہاں لڑکے کو شادی کے اخراجات جمع کرتے کرتے ایک عمر بیت جاتی ہے۔وہ ادھیڑ عمر کی دہلیز پر جا پہنچتا ہے۔''

''عرب ممالک ہی کیوں؟''نجمہ بتانے لگی۔''بھارت کے کئی مغربی اضلاع میں بھی یہ رسم عام ہے جہاں دولہا اپنی دلہن حاصل کرنے کے لئے لاکھوں روپیوں کا صدقہ اُتارتا ہے''۔

اُسے یاد آیا کہ نجمہ کچھ سالوں پہلے تک فخر سے بتایا کرتی تھی کہ اس کے تین لڑکے ہیں۔جو اس کا گھر جہیز سے بھر دیں گے۔مگر یہ اُلٹ پھیر؟!!

''گویا اب ہم لڑکیوں کے شکنجہ میں پھنس گئے ہیں''صبیحہ نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

''آپ کا بیٹا کیا کہتا ہے؟''جاوید کو پیچھے کھڑے دیکھ کر نجمہ نے کھوج لگائی۔

''امّی میں تو اچھا خاصہ کما لیتا ہوں۔میرا بزنس بھی خوب چل رہا ہے۔ہم ان کے مطالبات پورا کر دیں گے۔کب تک تم لڑکیوں کو ڈھونڈتی رہوگی؟''جاوید نے مداخلت کرتے ہوئے سوال کیا۔

''بیٹا......اتنی بڑی رقم ہاتھ سے نکل جائے تو مستقبل کا کیا ہوگا؟''صبیحہ نے بیٹے سے اپنی پریشانی ظاہر کی'کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے؟''

امّی جان......یہ تم آج سوچ رہی ہو کہ اتنا پیسا خرچ ہوگا!کیا وہ زمانہ بھول گئیں جب جہیز کے نام پر ہم لڑکی کے گھر والوں کو پریشان کیا کرتے تھے؟یہاں تک کہ کچھ صدیوں پہلے لڑکیوں کو زندہ در گور بھی کیا جاتا تھا۔اور ہمارا معاشرہ خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہا!آج جب کایا پلٹ گئی ہے تو کس بات کا رونا!!''جاوید نے حقیقت آشکارا کیا۔

''ہاں بیٹا!تم ٹھیک کہہ رہے ہو''صبیحہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اعتراف کیا۔''جہیز لانے کے لئے ہم عورتیں ہی اپنے شوہروں کو اُکساتی رہیں۔عورت ہو کر دوسری عورت پر ظلم ڈھاتی رہیں۔شاید اسی کا عذاب اب ہمارے سامنے آ گیا ہے!!''

''امّی جان ......''جاوید نے سچائی سے کام لیتے ہوئے بتایا'شادی تو سیدھی سادی ہونی چاہیے۔پہلے شادیوں کے نام پر بزنس ہوتا تھا۔آج لڑکیاں پڑھ لکھ کر اپنا ایک مقام بنا چکی ہیں۔قانون بھی ان کا ساتھ دے رہا ہے۔ہمیں زمانے کے

ساتھ چلنا ہے۔ ویسے لڑکیوں کو ان کا حق دینے میں کیا عار ہے''؟

''جاوید بیٹے تم ٹھیک کہتے ہو'' صبیحہ نے پہلے تو ٹھنڈی سانس بھری پھر ایک ہی سانس میں بتایا۔ ڈھیر سارا جہیز دینے کے لئے لڑکی کے والدین کے پاس ڈھیر سارا روپے کہاں ہوتا تھا؟ اس لئے انھوں نے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنا شروع کر دیا۔ لڑکیاں پیدا ہونے سے قبل ہی انھیں پیٹ میں ختم کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے اور لڑکیوں کے تناسب میں بڑا فرق آ گیا۔ لڑکیوں کی پیدائش کم ہونے کے سبب ان کے مطالبات بڑھنے لگے۔'' بات پتے کی تھی۔ اس لئے دم سادھے دونوں سنتے رہے۔ پھر نجمہ اٹھ کر جانے لگی۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ زمانہ دراز میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ آج تعلیم یافتہ قوم بھی بالواسطہ یہی کام کر رہی ہے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ہمیں زمانہ کے ساتھ چلنا ہے'' جاوید بیزارگی سے بتاتا ہے۔ ''امّی! میں پہلے ہی سے جہیز کے خلاف تھا۔ مگر تم جہیز لینے پر اڑی رہیں۔ اور پھر لگ بھگ ایک سال سے تمھیں ایک لڑکی بھی پسند نہیں آئی''۔

''تم ٹھیک کہتے ہو جاوید بیٹا'' صبیحہ نے بتایا ''میں تو ایک سال سے لڑکیاں تلاشتی رہی۔ مگر مجھے کوئی لڑکی تمھارے لائق نہیں جچی۔ ایک سے بڑھ کر ایک ماڈرن لڑکیاں نظر آئیں۔ پھر میں کیا کرتی؟''

''امّی .... مجھے ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس سے شادی کرلوں'' جاوید ہچکچاتے ہوئے پتّے کھولے۔

''مجھے بتاؤ بیٹے! تمھیں کون سی لڑکی پسند آ گئی ہے!!؟ صبیحہ نے اس طرح خوشی کا اظہار کیا جیسے اُس کے سر سے بوجھ ٹل گیا ہو!!

''وہ ہمارے محلے کے پیش امام صاحب ہیں نا''

''کیا وہ لڑکی ان کی رشتہ دار ہے؟'' صبیحہ نے جاوید کی بات کاٹ کر سوال کیا۔ ''نہیں ماں.....'' جاوید انکشاف کرتا ہے۔ ''وہ تو ان ہی کی لڑکی ہے!!''

''پیش امام کی لڑکی؟'' صبیحہ کی خوشیوں میں یکبارگی پانی پھرتا نظر آیا۔ پھر اس نے ناک بھوؤں چڑھا کر کہا ''وہ تو بہت غریب لوگ ہیں۔ ان کا ہمارا کیا جوڑ؟ پھر ان کی ہماری تعلیم میں بے حد تضاد بھی ہے۔ کیا تجھے دوسری لڑکی پسند نہیں آئی؟''

''امّی، تم تو ابّا کی غصیلی طبیعت سے واقف ہو'' جاوید نے وجہ بتائی۔ انھیں سنبھالنا کسی امیر گھرانے کی لڑکی سے نہیں ہو سکتا۔ میں اگر ایسی لڑکی سے شادی کرلوں تو میرا جینا دوبھر کر کے رکھ دے گی۔ ہو سکتا ہے خاندان میں پھوٹ ڈال دے''۔

''پھر؟'' صبیحہ چوکنا ہو کر ہو کر سیدھی بیٹھ گئی۔ جاوید کا خدشہ درست بھی ہو سکتا ہے۔

''انھیں ایک ایسی ہی لڑکی سنبھال سکتی ہے جو ٹھنڈے دماغ اور مزاج کی ہو۔ اسلام غصہ کو پی جانا سکھاتا ہے'' جاوید بتاتا رہا۔ ''اسلام سے واقفیت رکھنے والی لڑکی اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھ سکتی ہے''۔

صبیحہ کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ ''امّی اُس لڑکی میں کیا بُرائی ہے؟'' جاوید نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ عربی مدرسہ کی فارغ ہے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے۔ خانہ داری سے ضروری واقفیت رکھتی ہوگی۔ گھر بار بھی اچھی طرح سنبھال لے گی۔!!''

''نہیں نہیں! ایسی لڑکی سے میں تیری شادی ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ ہماری پوزیشن کیا خاک میں نہیں مل جائے گی؟ وہ کہاں! اور ہم کہاں؟ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا'' صبیحہ غصہ سے بپھر گئی۔ وہ غصہ میں بھول گئی کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے خود عورتوں کی حریص عادت کی شکایت کی تھی۔

''امّی جان۔ ہمیں خوب سیرت اور خوبصورت لڑکی کی ضرورت ہے' نہ ایک دولت مند کی'' جاوید نے ماں سے التجا کی۔ پھر........ ''امّی!! میں شادی اسی لڑکی سے کروں گا چاہے کچھ بھی ہو'' جاوید بغاوت پر آمادہ نظر آیا۔

''میں ایسی غریب خاندان کی لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کرنے دوں گی۔!!'' ماں نے وارننگ دی۔

''امّی تم تو لاکھوں خرچ کرنے کے لئے آمادہ تھیں'' جاوید مایوسی کا شکار نظر آیا۔ ''کیا اس دنیا میں شرافت کی کوئی قیمت نہیں''۔

''کیا تمھیں آفاق کی ازدواجی زندگی کی خبر نہیں؟'' جب دال گلتے نہیں دیکھا تو جاوید نے یاد دلایا۔ ''اس کی شادی کے صرف ایک ہی سال میں نوبت طلاق تک جا پہنچی تھی۔ پھر پولیس کے چکر میں پھنس کر عزت نیلام ہو گئی تھی۔ مہیلا کورٹ میں پھنسا دیے جانے کے بعد لاکھوں روپے دے کر اُسے گلوخلاصی کرنی پڑی تھی؟''

صبیحہ یکا یک چونک پڑی۔ آفاق صبیحہ کے تایازاد بھائی کا بیٹا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے ایک سنہرا خواب دیکھتے وقت کسی نے اسے سفّاکی سے جگا دیا ہو۔ تاہم اسے آنکھ کھلتے ہی ہر طرف ویرانہ نظر آنے لگا۔ صبیحہ کی آواز میں کھوکھلا پن آسانی سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس نے کمزور آواز میں پوچھا ''پھر بھی؟''

وہ کچھ دیر تک گُم سُم بیٹھی رہی۔ پھر بولیں ''بیٹا تو نے میری آنکھیں کھول دیں'' صبیحہ نے اعتراف کیا۔ ''میں تجھے آفاق کے راستے پر چلنے نہیں دوں گی۔ مجھے یاد آ گیا کہ وہ اور اس کے والدین کتنے پریشان رہا کرتے تھے۔ سکون کے درہم برہم ہوتے ہی آفاق اپنی دماغی حالت تک کھو بیٹھا تھا!!''

جاوید کو اب مسکہ سیدھی اُنگلی سے نکلتا نظر آیا۔

''مجھے ایک ایسی ہی بہو چاہیے تھی جو گھر میں سکون سے راج کرے۔ ساس کو ماں سمجھے۔ اب میں کبھی جہیز کے لئے ضد نہیں کروں گی۔ اسی سے ہی تیری شادی کروں گی۔ بالکل سیدھی سادی۔ شریعت کے مطابق اللہ کے پیارے رسول کی بھی سیدھی سادی شادی ہوئی تھی۔ جا........ میرا ضمیر جاگ گیا ہے''۔

''میری پیاری امی جان'' جاوید خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ماں کے قدموں پر جھک گیا۔ ''تم کتنی اچھی ہو!!'' صبیحہ نے اسے اٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔

☆☆☆

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
ایڈیٹر کوہسار جرنل۔ بھیکن پور۔3 بھاگل پور (بہار)

افسانہ

لہولہان وقت

ہم آج کیمپ میں بے حد دردناک زندگی جی رہے ہیں۔ جاڑے کی ان سرد راتوں میں اکثر میں نے سوچا ہے کہ اس رات امریش ہمیں ختم کر دیتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔

بھیڑ تشدد پر اتر آئی تھی۔ گولیوں کی بوچھار اور بموں کے دھماکوں نے پورے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ آدمی آدمی کا خون بہار ہا تھا یہ سب دھرم کے لیے ہو رہا تھا۔

میں ابا کے ساتھ چھت پر ریلنگ کے اوٹ میں دبکی موت کا یہ برہنہ رقص دیکھ رہی تھی۔ خوف کے مارے بدن کے رونگٹے کھڑے تھے۔

یوں فساد کے لئے فضا کئی مہنے سے تیار کی جا رہی تھی۔ لیکن ادھر چند دنوں سے افواہوں کا بازار زیادہ گرم تھا۔ ہر طرف ایک انجانا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ بہت سے لوگ محلّہ چھوڑ کر محفوظ مقاموں کی طرف چلے گئے تھے۔ میں بھی جانا چاہتی تھی۔ لیکن ابا نے کہہ دیا تھا کہ ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ آخر جائیں گے بھی کہاں! ایسا ماحول تو ہر تہوار کے موقع پر اور الیکشن سے پہلے بن جاتا ہے۔ ممکن ہے فساد ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ٹل جائے۔ مگر فساد ٹلا نہیں۔ ۶ر دسمبر کا کالا اتوار پھن پھیلا کر سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ تین بجے تک بابری مسجد کی شہادت کی خبریں ہر طرف پھیل چکی تھیں۔ اور اکثریتی فرقے کے لوگ طرح طرح سے خوشی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ ایسے میں ہی شر پسندوں نے بہانہ گھڑ لیا۔ حملے کیوں شروع ہو گئے، میں نہیں جانتی۔ دن ڈھلتے ڈھلتے اس میں تیزی آ گئی اور اب گھر سے نکلنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بڑے منصوبہ بند طریقے سے یہ سب ہو رہا تھا۔ پولیس کہیں پر نہیں تھی۔ کرفیو لگا یا تھا یا نہیں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرا محلّہ بھی لہولہان ہو رہا تھا۔ دور گھروں سے اُٹھتی آگ کی لپٹیں اپنا دائرہ تنگ کرنے لگی تھیں۔ میں نے ابا کی آنکھوں میں بدحواسی دیکھی۔ وہ کچھ بول نہیں رہے تھے۔ تبھی..... اچانک پچھلے دروازے کی کنڈی بج اٹھی۔ دل کی دھڑکن جیسے حلق تک آ گئی۔ کھٹ کھٹ..... کھٹ کھٹ...... پھر کنڈی بجی۔ میں نے سمجھ لیا۔ یہ موت کی دستک ہے۔

ابا نے بندوق مجھے تھما کر دروازے کے رُخ پر بٹھا دیا اور اشارے سے وہ سب کچھ سمجھا دیا۔ جو میں اس گھڑی فوراً سمجھ گئی۔ آنے والے خطرے سے فوراً نمٹنے کا انتظام کر کے ابا دبے پاؤں دروازے کے پاس چلے گئے اور درز سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

آہٹ پا کر دستک دینے والے نے آہستہ سے پکارا۔ آواز پہچان کر ابا نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ شاستری چچا میرے گھر سے پانچویں مکان کی دوری پر رہتے ہیں۔ ابا سے ان کی خوب نبھتی تھی۔ جب میں چھوٹی تھی تو ان کی گود اور ان کے کندھوں پر چڑھ کر انھیں خوب تنگ کیا کرتی تھی۔ اب بھی ہم روز ہی ایک دوسرے کے گھر جایا کرتے تھے۔ امی کے انتقال کے بعد شاستری چچی نے مجھے بہت پیار دیا تھا۔ سچ کہتی ہوں، دو ایک سال قبل تک ذات کا بھید بھاؤ ذرا بھی نہیں جانتی تھی۔ آج بھی شاستری چچا کو یوں چپکے سے اپنے گھر میں آتے دیکھ کر میرا ایمان ڈانواڈول نہیں ہوا۔ اور انسانیت پر ایمان مزید پختہ ہو گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ انھوں نے ابا سے پوچھا ''تم نے اب تک گھر کیوں نہیں چھوڑا۔ کسی محفوظ مقام پر چلے گئے ہوتے۔ دیکھتے نہیں، کیا کچھ ہو رہا ہے۔

''یہ سب آناً فاناً ہو گیا ہے۔ پھر میں کہاں جاتا۔ تم جیسے اپنوں کے بھروسے رہ گیا ہوں۔''

''اچھا چلو..... آؤ میرے ساتھ۔ غنڈے بلوائی محلّہ میں داخل ہو چکے ہیں۔''

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جلدی کرو۔ بیٹی کے بارے میں سوچو''۔

''شاید کرفیو لگ گیا ہے''۔

''اگر لگا بھی ہے تو تمھارے لئے، ہمارے لئے نہیں۔ اور غنڈوں پر تو اس کا اطلاق ہوتا ہی نہیں۔ جلدی کرو، پچھواڑے والی گلی اب بھی محفوظ ہے''۔

شاستری چچا کا مشورہ مجھے اچھا لگا۔ ابا نے میرا ارادہ بھانپ کر قدم بڑھایا۔ ہم بڑی احتیاط سے نکلے اور تنگ گلی سے گزرتے ہوئے ان کے گھر پہنچ گئے۔ میں نے یک گونہ سکون محسوس کیا۔ شاستری چچی نے چچا کو اشارہ کیا۔ اور ہمیں اوپر کے کمروں میں لے آئے۔ ہم نے خود کو یہاں محفوظ پایا.....

ابا اور وہ باتیں کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے پوچھا ''کوئی قیمتی سامان تو گھر میں نہیں رہ گیا؟

''نقدی اور زیورات آنگن میں گاڑ آیا ہوں۔ بندوق بیٹی لے آئی ہے۔ باقی سب کچھ جوں کا توں وہیں ہے''۔

مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں پانی لینے نیچے جانے لگی تو چچا نے سختی سے منع کر دیا۔ وہ خود پانی اور ناشتہ لینے کے لئے چلے گئے۔ انسانی جان و مال کی یہ تباہی

میرے دل ودماغ پر گہرے اثرات ڈال رہی تھی۔

شور کی آوازیں.....جذبات بھڑکانے والی آوازیں.....دہشت زدہ کرنے والی آوازیں۔اب قریب آچکی تھیں۔یکا یک ہم نے محسوس کیا کہ نیچے سے شاستری چچا کے بیٹے امریش کی تیز تیز آواز آرہی ہے۔ابا کے ساتھ میں بھی سیڑھیوں کے کنارے آکھڑی ہوئی۔وہ کہہ رہا تھا۔''انھیں مت بچایئے۔سانپ کو آستین میں چھپا کر آپ اپنا نقصان کررہے ہیں۔اگر میرے ساتھیوں کو بھنک مل گئی تو وہ ہمیں بھی نہیں بخشیں گے۔''

''جو بھی ہو میں انھیں یوں ہی نہیں مرنے دوں گا۔بچپن کا دوست ہے۔آخر بھگوان کو بھی جواب دینا ہے'تم عقل سے کام لو۔انھیں مار کر پاپ کے علاوہ کیا ملے گا۔اگر کچھ پانا ہی ہے تو دوستوں کو ان کے گھر سے سامان لے جانے دو۔ٹی وی' فریج' سب کچھ تو ہے۔اور سنو ان کے گھر کے آنگن میں نقدی اور زیور گڑا ہوا ہے جس جگہ کی زمین تازہ نظر آئے وہیں پر ہوگا۔نکال کر لے آؤ۔اور ہاں' آتے وقت اپنے ساتھیوں سے کہنا مکان میں آگ لگادیں''۔

''جے جے بابا کی.....''امریش قلانچیں بھرتا گھر سے نکل گیا۔لڑکھڑاتے قدموں سے ابا کمرے کے اندر آگئے۔میں نے انھیں سہارا دیا۔شور بہت قریب آچکا تھا۔

میں سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ابا بھی میرے قریب آگئے۔سامنے ہمارا گھر نظر آرہا تھا۔جسے بلوائیوں نے گھیر رکھا تھا۔لٹیرے گھر کا ایک ایک سامان اٹھا کر لے جارہے تھے.....پھر دیکھتے ہی دیکھتے شعلے لپکنے لگے۔میں نے خوف سے آنکھیں موند لیں۔

تبھی ابا کی گھٹی گھٹی سی چیخ بلند ہوئی گھبرا کر میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک پھندہ ان کی گردن میں کستا نظر آیا۔موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہی میں نے بندوق تان لی۔پھندہ چھوڑ کر امریش کو نیچے بھاگتے ہوئے ہم نے دیکھا۔ساری رات میں دروازے کی طرف بندوق تانے بیٹھی رہی۔ابا بے چینی سے ٹہلتے رہے۔

صبح کا اُجالا پھیلا تو ملٹری کی گاڑیاں نظر آئیں۔ابا نے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ☆☆☆

مختصر مختصر کہانیاں

حسن ساہو
Al-Hasnat Sector-V,
Hamdania Colony
Bemina . Srinagar-190018(J.&K)

تار تار زندگی

''اندھی کو کچھ دے دو...محتاج ہوں''۔راہِ خدا میں دیدو۔تمھارا بھلا ہوگا''

رات کے سناٹے میں یہ صدا فضا میں گونج رہی تھی۔ایک کمسن بھکارن چھڑی کے سہارے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ٹھیک اسی وقت آخری شو دیکھ کر کچھ لڑکے نمودار ہوگئے۔جب بھکارن صدا لگاتے تھک گئی تو ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔کشکول سے کچھ نکال کر کھانے لگی۔ہر جانب سناٹا تھا۔بھکارن ڈرنے لگی۔آج وہ بڑے دیر سے واپس لوٹ رہی تھی۔لڑکوں کے قدموں کی آواز بھکارن کو قریب سنائی دینے لگی۔اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا''کون ہے''۔

کسی نے قہقہہ لگا کر کہا''ابھی جان جاؤ گی''۔

''مجھے حاجی یوسف مسافر خانہ جانا ہے'خدارا بڑے چوک تک پہنچادو''۔

''آؤ ہمارے ساتھ:مسافر خانہ پاس میں ہی ہے''۔ایک جوان نے بھکارن کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔کچھ دور جا کر بھکارن کو محسوس ہوا کہ اسے کسی اور جگہ لیا جارہا ہے۔

''خدارا بتاؤ مجھے کہاں لے جارہے ہو''

بدلے میں تینوں لڑکوں کے قہقہے بلند ہوگئے۔اور ایک ساتھ کہہ گئے''ہم تمھیں ویران حویلی میں لے آیے ہیں''۔بھکارن خوف کے مارے چیخ پڑی۔اس کی دلدوز آواز فضا میں تحلیل ہوتی گئی۔اور بالآخر اُس کی چیخ گلے میں گھٹ کر رہ گئی....ابلیسانہ ہاتھ آگے بڑھنے لگے۔اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک لڑکے نے بھکارن کو اپنے آہنی بانہوں کے شکنجے میں دبوچ لیا۔کشکول'چھڑی اور پھٹی اوڑھنی ایک ایک کرکے الگ کردیے گئے۔الغرض شیطان صفت لڑکوں نے اپنی جنسی بھوک مٹانے کی چاہ میں ایک بے بس اور لاچار بھکارن کے دامنِ عصمت کو تار تار کرکے رکھ دیا۔

درندگی وحیوانیت سے لبریز طوفان تھم گیا تو بھکارن اپنے نڈھال و بے سکت جسم کو بارگراں کی طرح سنبھالتی اُٹھی۔اچانک ایک لڑکے نے چھڑی' کشکول اور پھٹی چادر کے علاوہ اس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھما دیے۔اب سنسان جگہ پر وہ اکیلی تھی۔چاہا نوٹوں کو پھاڑ کر ہوا میں اُچھال دے'اتنے میں اس کے ضمیر نے اُسے جھنجوڑا۔

''رضیہ تیرے نوٹ پھاڑنے سے کیا ہوگا۔اس بگڑے سماج اور پلید معاشرے میں نہ جانے کتنی نیم خام کلیاں روزانہ ہوس کا نشانہ بن رہی ہیں۔مجبور اور لاچار لڑکیوں کا ہر دور میں یہی حشر ہوا کرتا ہے''۔اس کے ساتھ رضیہ مرے مرے قدموں کے ساتھ سوچوں کی نگری میں گُم آگے بڑھنے لگی۔

☆☆☆

ملبے کا ڈھیر

خوشی اور مسرت کے آنسوؤں کے ساتھ ذاکرہ کو پالکی میں بٹھا دیا گیا اور دولہا اشفاق گھوڑے پر سوار اپنی منزل کو رواں دواں......

بارات دلہن کے گھر سے نکل کر شہر کے چوراہے سے گزر رہی تھی کہ اچانک پاس والے بازار میں افراتفری مچ گئی۔آن واحد میں بارات کی شہنائیاں لوگوں کی دردناک چیخوں میں دب کر رہ گئیں۔جگہ جگہ آگ کے شعلے بلند ہوتے گئے۔لوگوں کی چیخ و پکار سے پرندے بھی خوف و دہشت میں اِدھر اُدھر اڑنے لگے....دولہا کا گھوڑا گولہ باری کی زد میں آ گیا اور اشفاق گھوڑے سے گرتے ہی دائمی نیند سو گیا۔

چاروں طرف درندگی کا برہنہ رقص ہو رہا تھا۔ذاکرہ بے بسی کے عالم میں مدد کے لئے پکار رہی تھی....کون اُس کی سنتا۔نفسا نفسی کا دور....اتنے میں آگ کا گولہ پالکی پر آ گرا۔اور ساری فضا ذاکرہ کی دل خراش نالوں سے لرز اٹھی'اور لمحوں میں پالکی اور اس میں بیٹھی ذاکرہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔

ہر طرف قیامت صغرا کا منظر تھا۔ان گنت انسانی لاشیں چوراہے پر پڑی تھیں۔چاروں جانب دھواں ہی دھواں تھا۔آگ کے شعلے تھے....چیخ و پکار تھی'اور آہ و بکا۔یہ خونین منظر دیکھ کر زمین فریاد کر رہی تھی۔

اے انسانیت کے قاتلو۔کیا آج کا دن دیکھنے کے لیے میں آپ کا بوجھ اُٹھائے پھر رہی ہوں''۔بھاری قدموں کی آواز ابھری۔پولیس کی گاڑیاں شہر میں گشت کرنے لگیں۔سرکاری کارندے کرفیو کے نفاذ کا اعلان کرتے گئے۔زندگی اپنے نام سے کانپ رہی تھی۔

کئی روز بعد کرفیو میں فقط تین گھنٹے کی ڈھیل دی گئی۔بھوکے'لاچار اور مجبور لوگ ہجوم در ہجوم سڑکوں پر نکل پڑے۔ہر چہرا ڈرا ہوا سہما ہوا۔کتنے ہی آباد گھرانے اس فساد میں برباد ہو گئے۔کتنی ہی ماں بہنوں کے سہارے چھن گئے۔بستی کا ہر گھرانہ ماتم کدہ ہو گیا تھا۔کوئی کسی کا پُرسان حال نہ تھا۔

بڑے چوک میں جلے ہوئے مکانوں اور دکانوں کے ملبے کا ڈھیر پڑا ہے جس میں کچھ سوختہ انسانی پیکر بھی دبے پڑے ہیں۔لوگ اس ملبے کے ڈھیر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔اس ملبے میں غالبًا کیا بلکہ یقینی طور پر ذاکرہ اور اشفاق کے سوختہ جسم بھی پڑے ہیں۔ایسی تشویش ناک صورت حال میں اچانک لاؤڈ اسپیکر سے آواز خاموش فضا میں گونج اٹھی۔:۔

''مرنے والوں کی یاد میں بڑے چوک میں آج دو بجے تعزیتی جلسہ منعقد ہوگا جس میں عوامی زعماء کرام کی شرکت بھی متوقع ہے۔لہٰذا ملبے کے ڈھیر کو شہر سے باہر پھینکنے کے احکامات پر عمل درآمد سُرعت سے ہوگا''۔

☆☆☆

ایس۔کیو۔عالم طلعت

Kashana.PumpHouse
Road.TORWA,(C.G.)

کرب

انوار صاحب نے اردو اور انگریزی میں ایم اے کیا اور رونگٹا کالج میں پروفیسر ہو گئے۔کرکٹ کے اچھے کھلاڑی ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔اکثر نزدیک و دور کے مشاعروں میں شرکت بھی ہوتی تھی۔ہندوستان کے اکثر جریدوں میں اُن کا مقام تھا اور غزلیں قریب قریب ہر ماہ کسی نہ کسی پرچے میں شائع ہوتی تھیں۔والدین نے ان کی شادی گاؤں میں رہنے والی ایک رشتہ دار کی لڑکی سے کر دی۔رضیہ بڑی حسین و جمیل تھی اور خوبصورت بیوی پا کر وہ بہت خوش تھے۔

ایک سال بعد ہی جہاں نادر کی پیدائش ہوئی وہیں ان کے والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔گھر اب انوار صاحب'ان کی اہلیہ اور نادر میں سمٹ گیا تھا۔

اہلیہ جہاں بے پناہ حسن کی مالک تھی وہیں تعلیم کے معاملہ میں صفر۔پروفیسر کی مشغولیت'ادب و اسپورٹس کو دیکھ کر ان کے اندر کچھ جلن نے گھر بنا لیا۔اکثر دونوں کے درمیان بحث و مباحثہ کا ماحول رہنے لگا۔

نادر اسکول جانے لگا۔رضیہ اکثر اسے دل لگا کر پڑھنے کی نصیحت کرتی'اور ایک دفعہ نادر نے ماں کو کہہ دیا کہ کیا ہوگا زیادہ پڑھنے سے'ابو بھی تو اس قدر قابل ہیں لیکن آپ کی نظر میں ان کی کیا حیثیت ہے۔رضیہ سنّاٹے میں آ گئی' کچھ دیر وہ بالکل خاموش رہی اور پھر غصے میں آ کر نادر کی جم کر پٹائی کر دی۔رضیہ کو شعر و شاعری سے اتنی نفرت ہوگئی کہ جتنے پرچے آتے اسے نذرِ آتش کر دیتی۔اس دن بھی انوار صاحب کالج سے لوٹے تو ایک پرچہ جلاتے دیکھ لیا۔اس پرچے میں انوار صاحب کا سوانحی خاکہ بھی شائع ہوا تھا۔چولھے سے نکال کر بجھانے کی کوشش کی لیکن تب تک نصف سے زیادہ جل چکا تھا۔بہت غصہ آیا پر کر بھی کیا سکتے تھے۔کسی طرح چائے ناشتے سے فارغ ہوئے' اپنی ڈگریاں' سرٹی فکیٹ الماری سے نکالے'غزلوں کی ڈائری نکالی اور سب کو بیلٹ کے سہارے سینے پر باندھا' کپڑے پہنے اور باہر جانے لگے تو رضیہ نے ہنستے ہوئے کہا آج یہ کیا خبط سوار ہوا ہے'لیکن انوار صاحب کچھ بولے بغیر نادر کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا اور گھر سے نکل پڑے۔

تھوڑی ہی دیر میں باہر سے آوازیں آنے لگیں۔ پروفیسر صاحب کنوئیں میں گر گئے۔ جب تک انھیں نکالا جاتا وہ ملک عدم کو سدھار چکے تھے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے جایا گیا۔ جب بیلٹ کھول کر کاغذات جسم سے الگ کئے گئے تو اس سے سوسائیڈ نوٹ نہیں نکلا۔ حسن صاحب جو پروفیسر تھے انھوں نے غزلوں کی ڈائری پولیس کی اجازت سے اٹھالی۔

پوسٹ مارٹم کے بعد جب لاش گھر لائی گئی تو رضیہ چیخ مار کر لاش سے چمٹ گئی۔ قابلیت پر جہالت کی فتح ہوگئی تھی۔ پھر رضیہ کو کسی نے بولتے نہیں سُنا۔

حسن صاحب نے غزلیں اردو اکیڈمی کو بھیج دیں۔ اکیڈمی نے مجموعہ کو ''کرب'' کے نام سے شائع کیا۔ حکومت نے انوار کی بیوہ کو تاعمر وظیفہ دینے کا اعلان اور پروفیسر انوار کو پس ازمرگ ڈاکٹریٹ عطا کی۔

☆☆☆

انجینئر سید فرید دسنوی
PlotNo.85,Sector.7
C-D-A,Colony,Cuttack-14

اللہ کا نائب

اللہ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں انسان نامی مخلوق کو پیدا کرنے والا ہوں۔ چونکہ اسے کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بنایا جائے گا اس لئے اُس میں پستی کی جانب جانے کا رجحان ہوگا' مگر جب میں اس میں اپنی روح پھونکوں گا تو یہ بہت بلندی تک جائے گا۔ اگر چہ اس میں بشری تقاضے بھی ہوں گے۔ نفسانی خواہش' نیکی اور بدی' بھوک پیاس وغیرہ۔ مگر وہ بشری تقاضوں کو قابو میں رکھ کر میری عبادت میں دن رات مشغول رہے گا۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کا غلبہ ہوگا' آرام دہ بستر اور آسائش کی ہر چیز میسر ہوگی' مگر صرف اللہ کے خوف سے اس کے پہلو بستر سے الگ ہوں گے۔

اُن میں بہت سے عالمِ دین بہت اونچائی تک پہنچیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے انسان کو اپنا نائب بنایا۔

ہر دو عالم خاک شد تا نقشِ بندِ آدمی
اے بہارِ نیستی از خود قدر ہوشیار باشی

جسم کے داغ

تو کہیں پاگل تو نہیں ہے؟ بیوی نہا رہی ہے اور تو چھپ چھپ کر اسے دیکھ رہا ہے؟ کیا تجھے پاس آنے نہیں دیتی؟

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنے جسم کے داغ کو چھپاتی ہے مجھ سے۔''

''کیا خدانخواستہ کوئی بیماری ہے''؟

''نہیں! دراصل لال پری کے زیر اثر میں نے رات ڈنڈا اٹھالیا تھا۔''

''کہیں وہ تجھے چھوڑ کر بھاگ تو نہیں رہی ہے؟''

''نہیں اسے فکر ہے کمائے گا کون اور کھانا پکائے گا کون؟''

سرائے خانہ

''کیا میں یہاں رات گزار سکتا ہوں''؟ درویش نے جابر بادشاہ سے پوچھا۔

''کیوں یہ کیا سرائے خانہ نظر آتا ہے''؟

''اچھا ذرا یہ بتائیے' آپ سے پہلے یہاں کون رہتا تھا؟''

''میرا باپ''

''اور اس سے پہلے''؟

''میرا دادا''

''اور اُس سے پہلے''؟

''میرا پردادا'' جھنجھلا کر بادشاہ نے کہا۔

''اور آپ پھر بھی کہتے ہیں یہ سرائے خانہ نہیں ہے۔'' درویش نے مسکرا کر کہا۔

استعفیٰ کے بعد....

ملک کی فضا خراب ہو رہی ہے Rationalist کو گولی کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ رواداری نام کو بھی نہیں ہے۔ آج کی تاریخ میں 78 فنکاروں نے یا تو اکاڈمی اعزازات واپس کر دیے یا اپنے عہدوں سے مستعفی ہوگیے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں بھی استعفیٰ دے دوں۔

''لیکن سر! آپ اس پایہ کے فن کار نہیں ہیں''۔

''استعفیٰ کے بعد یقیناً اس پایہ کا ہو جاؤں گا''

☆☆☆

ادبی محاذ کے مدیرِ معاون جناب سید نور الٰہی ناطق اور منیجنگ ایڈیٹر جناب سمیع الحق شاکر کا سفرِ حج

قارئین ادبی محاذ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ ہمارے مدیرِ معاون جناب نور الٰہی ناطق صاحب اور منیجنگ ایڈیٹر جناب سمیع الحق شاکر صاحب حرمین شریفین کی زیارت اور حج کی سعادت حاصل کر کے وطن لوٹ آیے ہیں۔

ادارہ ان دونوں حضرات کو اس شرف یابی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

☆☆☆

غـــزلیـــات

شفیع اقبال

Editor,Parwan-e-Deccan
HillCottage.13-1-1235/309
JhirraP.O:Karwan.Hyd-500006

تہذیبِ نو میں خود کو یہاں ڈھالنا پڑا
دیوانگی سے ہوش و خرد مانگنا پڑا
ان کی شکست مجھ کو گوارا نہ ہو سکی
بازی کو جیت کر بھی مجھے ہارنا پڑا
مبہم سی گفتگو تھی نگاہوں کی اس لیے
لفظوں کی چلمنوں سے انھیں جھانکنا پڑا
وعدہ کیا تھا ہم نے ملاقات کا مگر
ان ہی کی بے رخی کے سبب ٹالنا پڑا
جذباتِ دل کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر
دنیا کو یوں متاعِ سخن بانٹنا پڑا
سورج نیے نیے جو ابھرنے لگے شفیع
تاریکیوں کو زادِ سفر باندھنا پڑا

عبدالسلام کوثر

ShastriChowk.Tulsipur
DistRajnandgaon-491441(C.G)
Mob-9300212960

جانِ من یوں نہ کر حذر ہم سے
زندگی ہے حسین تر ہم سے
تمکنت میں ہے گر نہ جایے کہیں
چل رہا ہے جو تیز تر ہم سے
سر میں سودا تھا خودنمائی کا
ہوگیے لوگ بے خبر ہم سے
ہم جو برہم ہوے تو مشکل ہے
نرم لہجے میں بات کر ہم سے
اپنا مسلک ہے اسوۂ حسنہٰ
کون ہوگا عظیم تر ہم سے
جو ہماری غزل کا حاصل ہے
بدگماں ہے وہی نظر ہم سے
حسن والوں سے اور وفا کوثر
یہ خطا ہوگئی مگر ہم سے

محمد امجد سلیم امجد

Mukarrampur.KarimNagar(T.S)
Mob-9550664623

وطن میں اپنے دہشت کا گزر اچھا نہیں لگتا
فسادوں کا یہ ماحولِ دگر اچھا نہیں لگتا
مسیحا میرے زخموں پر نمک پاشی ہی کرتا ہے
مسیحا کا مداوائے جگر اچھا نہیں لگتا
بڑی فرقہ پرستی ہے سیاسی حکمرانوں میں
سیاست میں تعصب کا اثر اچھا نہیں لگتا
ہمیشہ ڈٹ کے رہتا ہے شریعت کے وہ رستے پر
مجاہد کو رہِ حق سے مفر اچھا نہیں لگتا
جہادِ زندگانی کے عزائم میں کسی صورت
اگر اچھا نہیں لگتا مگر اچھا نہیں لگتا
میں اپنی منزلِ مقصود پر ہوں گامزن تنہا
"مجھے پامال رستوں کا سفر اچھا نہیں لگتا"
جسے ملتی ہے روزانہ جہاں میں مفت کی روٹی
اسے محنت کا اے امجد ثمر اچھا نہیں لگتا

مقبول منظر

MuslimNagar.DaltonGanj
Palamu(JHarkhand)

ہے اس پڑاؤ پہ رکنا خیالِ خام ابھی
ترے قیام کا آیا نہیں مقام ابھی
مجھے قبول نہیں پیار کا مقام ابھی
ہیں زندگی کے ادھورے بہت سے کام ابھی
کریں گے بچھڑے ہوؤں سے وہ خاک ہمدردی
بنے ہوئے ہیں تکبر کے جو غلام ابھی
اکیلے پن کا رلاتا نہیں مجھے احساس
کہ ہو رہی ہے تری یاد ہمکلام ابھی
سفر ہے فرض رضائے خدا بھی ہے منظر
کر اپنے زادِ سفر کا کچھ انتظام ابھی

احمد امام بالاپوری

ChudiMahal.Balapur
Amravati-444302(M.S)
Mob-9527945857

حضور والا سچائی کا منظر دیکھتے بھی ہو
برستے ہیں ہمارے سر پہ پتھر دیکھتے بھی ہو
ستارے توڑ لانا ہے بہت آسان کہہ دینا
ہمارے پر لہو میں ہوگیے تر دیکھتے بھی ہو
عزیزو! آج پھر ہم نے بھرے دربارِ شاہی میں
نشاط و عیش کو ماری ہے ٹھوکر دیکھتے بھی ہو
مخیّر لوگ بھی ہیں شورشِ آلام کی زد میں
ہے تا حدِ نظر پھیلا ہوا شر دیکھتے بھی ہو
کہ بس تنقید کرتے ہو مری غزلوں پہ نقادو
کبھی تم کیا ہے بدتر" کیا ہے بہتر دیکھتے بھی ہو
مرا اسلوبِ فکر و فن کسی دم میرے ہم عصرو
حصارِ خود پسندی سے نکل کر دیکھتے بھی ہو

اختر کاظمی

349,Arabpur.NearBasantTalkies
Fatehpur-212601(U.P)

چلن بدلا ہوا ہے ہم نفس کا ہمنواؤں کا
یہ جاں سوزی ہے کیسی رقص ہے کیسی ہواؤں کا
ہمیشہ آنکھ متلاشی رہی اپنوں میں اپنوں کی
بدل ڈھونڈا کیا دل ہر گھڑی محرم وفاؤں کا
انھیں کی گود میں تہذیب کی تشکیل ہوتی ہے
ہر اک کردار سازی میں ہے شامل ہاتھ ماؤں کا
مورّخ جو لکھے گا اب نئی تاریخ انسانی
قلم میں کرب بھر جایے گا کتنی ہی بلاؤں کا
ہمارے جیسے لاکھوں کیفرِ کردار جو ہوں گے
تو حال اچھا نہیں ہوگا مگر کچھ پارساؤں کا
کشش معدوم ہوتی جارہی ہے آج چہرے سے
اثر ہوتا نہیں ہے اب کوئی اس کی اداؤں کا
سبھی کوشاں ہیں اختر بال و پر میرے کترنے کو
ذرا ذکرِ سفر جو کر دیا میں نے خلاؤں کا

قدیر احمد قدیر

K.M.Balekundri.L.I.G-11-LE-9
NavidManzil.KrishnaColony
HUlkoti-525205(Karnataka)
Mob-9980208578

جینے کی آدمی کو ادا آۓ گی ضرور
امن و سلامتی کی فضا آۓ گی ضرور
سر پر ہے تیز دھوپ تمازت ہے جا بجا
ٹھنڈی ہوا کے ساتھ گھٹا آۓ گی ضرور
جب دور ہوں گی دل سے یہ آپس کی رنجشیں
باہم رفاقتوں کی فضا آۓ گی ضرور
مانا کہ تند و تیز ہیں نفرت کی آندھیاں
پیغامِ امن لے کے صبا آۓ گی ضرور
فرمانِ رب کا دل سے بھلائیں گے ہم اگر
کوئی نہ کوئی سر پہ بلا آۓ گی ضرور
موسم یہ تلخیوں کا گزر جانے دیجے
"کھولو گے کھڑکیاں تو ہوا آۓ گی ضرور"
آنسو ندامتوں کے بہائیں گے گر قدیر
رب کو پسند ایسی ادا آۓ گی ضرور

شمس الحق شمس

Deopur.P.O:Biribati,Dt:Cuttack-754110
Mob-9338815869

سرِ مقتل دوانہ جارہا ہے
سزا حق بات کی وہ پارہا ہے
ہمارے درد کا دل سوز منظر
زمانے کو دکھایا جارہا ہے
زمیں پر دیکھ کر ندیاں لہو کی
فلک گلنار ہوتا جارہا ہے
ہزاروں بے گنہہ لوگوں کو اب تو
صلیبوں پر چڑھایا جارہا ہے
کہاں تک ہم کریں گے صبر یارب
ستم کا زور بڑھتا جارہا ہے
کلامِ شمس ہے آئینہ جس میں
ہر اک چہرہ دکھایا جارہا ہے

مصطفٰی عادل

H.NO:13-44,MohallaDastagir.
P.O:Chiguppa.Dt:Bidar-585412
(Karnataka) Mob-8099750427

موسم بدل گیا یہ نظارے بدل گیے
آئی تمہاری یاد تو ارماں مچل گیے
آنکھیں ہماری خشک تھیں مدت سے دوستو
کیا ہوگیا یہ آج کہ آنسو نکل گیے
اک شمع جس طرح سے پگھلتی ہے رات بھر
اس طرح غم کی آگ میں ہم بھی پگھل گیے
ظلم و ستم نیے نیے ہوتے ہیں آج بھی
کہتے ہو تم کہ ظلم کے آثار ٹل گیے
تھا شوق راستے میں اجالا بکھیر دوں
عادل! اس آرزو میں میرے ہاتھ جل گیے

مصطفٰی دلکش

Vill:Gangwara.P.O:Bishanpur
Via:Jogiyara.Dt:Sitamarhi-843303

جتنے تھے فتنہ ساز حکومت میں آگیے
ہم پھر پلٹ کے دورِ جہالت میں آگیے
جو تھے دروغ گو وہ وکالت میں آگیے
مظلوم کی ہو خیر عدالت میں آگیے
اپنا وقار آپ گنوا بیٹھے اس طرح
اک چور کی جناب حفاظت میں آگیے
بے خوف جی رہے ہیں گنہگار آج کل
معصوم بے گناہ حراست میں آگیے
اجداد کی وہ اپنے نصیحت کو بھول کر
دو خاندان آج عداوت میں آگیے
اب ملک کی ہو خیر اے دلکش خدا کرے
قاتل ہمارے جو تھے سیاست میں آگیے

اوج اکبرپوری

At:AkbarpurRohtas-821311(Bihar)

افسانۂ حیات کا دفتر سمیٹ لو
اپنی سخن طرازی کا تیور سمیٹ لو
بند ہونے والا ہے درِ میخانہ میکشو!
تم بھی خمار توڑ دو ساغر سمیٹ لو
رخصت ہوئی بہار پرندو خبر بھی ہے
گلشن میں آگئی ہے خزاں پر سمیٹ لو
رحمت خدا کی خود ہی پکارے گی یومِ حشر
امت کو اپنی ساقیٔ کوثر سمیٹ لو
بولے حسینؓ روزِ جزا کام آۓ گا
مظلومیت کے خون کو اصغر سمیٹ لو
قطروں سے بجھنے والی نہیں ہے یہ تشنگی
ہے وقت کا تقاضا سمندر سمیٹ لو
رسوا سرِ بازار نہ ہوجاؤ تم اے اوج
خوش قامتی کا اپنی یہ پیکر سمیٹ لو

ایم۔اے۔حمید عکسی

No:14-6-39,Nizampura
MandiBazar.waramgal-2(T.S)

سمجھتے ہو جسے مشکل وہی اک کام کر دیکھو
کبھی سنگلاخ رستوں پر بھی تم کر کے سفر دیکھو
کبھی تو ڈال کر ہم پر محبت کی نظر دیکھو
"کبھی تو بھول کر آؤ، کبھی تو پوچھ کر دیکھو"
تم اپنے دل کی گہرائی سے مانگو اپنے مولیٰ سے
پھر اس کے بعد ہوتا ہے دعا میں کیا اثر دیکھو
ہمیں بخشی گئی جو زندگی وہ چار روزہ ہے
مگر کتنا ہے مشکل چار دن کا یہ سفر دیکھو
ہوا پھر کس سے ایسا معجزہ دنیا کے مطلع پر
تمھیں دعویٰ ہے گر تو شق کبھی کر کے قمر دیکھو
ہزاروں کوششیں کر لو پہ عکسی ان سے کیا حاصل
جو قسمت میں ہے لکھا پاؤ گے تم وہ ثمر دیکھو

مسلم نواز
BaitulQasim.12/3/H1,Patwar
BaganLane.Kolkata-700009
Mob-9681811271

میں گر کے ٹوٹ گیا کانچ کا کھلونا تھا
مرے نصیب میں لکھا تھا جو وہ ہونا تھا
کسی کے پاس کوئی شے سدا نہیں رہتی
کسی کو پا کے مجھے ایک دن تو کھونا تھا
ہزار بار بھلایا مگر بھلا نہ سکا
خیال اس کا مرا اوڑھنا بچھونا تھا
جہاں جلایے گیے تھے امید کے پودے
کہ بیج امید کا مجھ کو وہیں پہ بونا تھا
سنا رہا تھا کہانی تو رو رہے تھے سبھی
کہ رونے والوں میں شامل مجھے تو ہونا تھا
نوازؔ میرا سفینہ کبھی نہ غرق ہوا
ڈبو چکے وہ سفینہ جنھیں ڈبونا تھا

شاہ نواز انصاری
Moh:Matwana.MachhliShaer
Jaunpur(U.P)
Mob-7398506948

رواں ہے خون نبضوں میں نیے ارمان پیدا کر
تو اپنے حوصلوں سے پتھروں میں جان پیدا کر
فضاؤں میں اگر پرواز کی تجھ کو تمنا ہے
تو اپنے دست و بازو میں عقابی شان پیدا کر
کوئی بندش نہ تجھ کو روک پایے گی زمانے کی
عزائم میں تو اپنے غازیوں کی شان پیدا کر
نشانِ تیرگی مٹ جایے دنیا سے اگر دل میں
وہی ایمان پیدا کر، وہی عرفان پیدا کر
یہ دنیا پھر صلاح الدین کے قدموں پہ جھک جایے
مگر پہلے تو اپنی قوم میں سلطان پیدا کر
زمانہ تجھ سے ٹکرا کر خود اپنی موت مر جایے
ارادوں میں اگر تو آہنی چٹان پیدا کر
یہ تھک کر بیٹھ جانا شہنوازؔ اچھا نہیں لگتا
چل اٹھ کر منزلِ مقصود کا سامان پیدا کر

یوسف آزاد
ZilaParishadSchool Urdu No-2
Kagzipura.P.O:Erandol-425109
Jalgaon

دیوانے جب سے اپنے چمن لوٹ آیے ہیں
زد میں خزاؤں کی بھی بہت گل کھلایے ہیں
دشمن کی ہار ہوگئی میدانِ جنگ میں
ماں کی دعائیں ساتھ تھیں ہم جیت آیے ہیں
کانٹوں نے جو دیے تھے ہمیں زخم بھر گیے
لیکن وہ بھر نہ پایے جو پھولوں سے کھایے ہیں
یہ زندگی ہے اپنے لیے ایک امتحاں
ہم آخرت کمانے کو دنیا میں آیے ہیں
بانٹا جنھوں نے اوروں کے غم کو سدا یہاں
راحت کے لمحے ایسے ہی لوگوں نے پایے ہیں
اس کے ہی پاؤں ہوگیے یوسفؔ لہولہان
جس نے ہماری راہ میں کانٹے بچھایے ہیں

سالک ادیب
At:QaziMohall.P.O:Padhanpada
Bhadrak-756114(Odisha)

میرے افکار و خیالات پہ تنقید کرو
روبرو آ کے مری ذات پہ تنقید کرو
چاند کا حسن تو تم سے نہیں ہوسکتا بیاں
کم نگاہو! شبِ ظلمات پہ تنقید کرو
تم سے اک قطرہ نہ آنسو کا بہے گا لیکن
کبھی فرصت ہوتو برسات پہ تنقید کرو
جب بھی ملتا ہوں میں زخموں پہ چھڑکتا ہوں نمک
میرے اس طرزِ ملاقات پہ تنقید کرو
روز و شب میرے گزرتے ہیں فقط باتوں میں
میرے دن اور میری رات پہ تنقید کرو
غم کے آثار تو سالکؔ میں نہ مل پائیں گے
اس کی خوشیون ہی کی سوغات پہ تنقید کرو

اسعد قاسمی
H.No:B-78,StreetNo-18,NearJannatiMasjid
MaaanSighNagar.OldMustafaabad
Delhi-110094. Mob-9958401915

یہ تو فانی ہے جہاں رہ کے بتایے کوئی
کام ممکن ہو تو پھر کر کے دکھایے کوئی
مجھ کو بیگانوں سے شکوہ ہے نہ اپنوں سے گلہ
پھر بھی کیوں مجھ سے شکایت ہے بتایے کوئی
زندگی پاک خطاؤں سے بھی ہوسکتی ہے
جا کے مسجد میں ذرا اشک بہایے کوئی
کس نے گلشن کو اجاڑا اسے معلوم نہیں
ہاتھ کس کا ہے یہ مالی کو بتایے کوئی
روز و شب کر کے دعا میں نے تمھیں مانگا ہے
تم پہ دنیا میں کبھی آنچ نہ آیے کوئی
سارے احباب غزل سن کے مری بول اٹھے
کاش اسعدؔ کی طرح پڑھ کے سنایے کوئی

عظیم الدین عظیم
PlotNo:78/427,LotusGarden.
Jadupur.BHubaneswar-751019
Odisha. Mob-9938162271

دل سے دل کا ہوگیا جب رابطہ اچھا لگا
ملنے جلنے کا حسیں یہ سلسلہ اچھا لگا
سیدھے رستے پر تو چلنا ہے بہت آساں مگر
مجھ کو لیکن ٹیڑھا میڑھا راستہ اچھا لگا
جن کی فطرت میں ہے شامل جھوٹ، دھوکہ اور فریب
ایسے لوگوں سے مجھے ہر فاصلہ اچھا لگا
جب کسی مظلوم کے اشکوں کو پونچھا آپ نے
آپ کا انسانیت سے واسطہ اچھا لگا
جس کی پلکوں پر سدا رہتے تھے آنسو اے عظیمؔ
اس کے ہونٹوں پر تبسم باخدا اچھا لگا

کتابوں کے شہر میں

(تبصرے کے لئے دو کاپیوں کا آنا ضروری ہے)

اگر اپنی کتابوں کا اشتہار بھی دیں تو تبصرہ ترجیحی بنیاد پر جلد شائع کیا جایے گا۔ ایک صفحے کے اشتہار کی شرح ایک ہزار روپے ہے۔ تبصرے کے لئے کافی کتابیں جمع ہو چکی ہیں۔ ان پر تبصرہ ترتیب وار شائع ہوتا رہے گا۔ (ادارہ)

نام کتاب: پودا میرے آنگن کا　　مصنف: عظیم نواز راہی

مبصر: مفتی حبیب الرحمٰن ندوی! ماٹر گاؤں خورد، تعلقہ شیگاؤں، ضلع بلڈانہ، مہاراشٹر (انڈیا) موبائل نمبر 09767113554

مراٹھی اور اُردو کے مشہور و معروف ادیب، شاعر و ناظم، عظیم نواز راہی صاحب کی نظامت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی مراٹھی نظامت کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے، اور آغاز میں اُس مالک و مولیٰ کا وہ اظہار تشکر کرتے ہیں جس نے مٹّی کے پتلے کو گویائی عطا کی۔ معبودِ حقیقی کے تذکرہ سے عظیم نواز راہی صاحب کی نظامت میں وہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ تقریب کو بھول کر صرف نظامت کو یاد رکھتے ہیں۔

گزشتہ ۲۵/ برسوں سے اپنی آب و تاب کے ساتھ سلسلۂ نظامت قائم و دائم ہے، نظامت نے ہی عظیم نواز راہی صاحب کو شہرت سے چکا چوند چہرہ بخشا روزگار کے راستے آراستہ کئے۔ وہ خود اپنے پیش لفظ "غزل کے موسم کا پتہ" میں رقمطراز ہیں۔

"آج میری زندگی میں یہ آئی ہوئی عزت و شہرت کی چکا چوند مراٹھی زبان کی بدولت ہے، مراٹھی نے نام و نمود بخشا، ساکھر کھیرڈا جیسے سنگلاخ علاقے کے جعفر آباد محلّہ سے نکلی ہوئی اؤبڑ کھابڑ پگڈنڈی، ریاست مہاراشٹر کی چمکیلی شاہراہوں سے جاملی، اس ۴۵/ سالہ تخلیقی سفر میں مراٹھی زبان ترقی و کامرانی کی ضامن بنی، مراٹھی نے خوب نوازا اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ آج الحمدللہ دسویں کے نصاب میں اور تین یونیورسٹیوں کے نصاب میں عظیم نواز راہی صاحب کی نظمیں شامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ۲۰۰۴ء میں ان کا سب سے پہلا مجموعہ کلام "وے ہارا چا کاڑ اگھوڈا" شائع ہو کر منظر عام پر آتے ہی ایک ہی سال کے اندر اندر کم و بیش پندرہ ۱۵/ ایوارڈ حاصل کر چکا ہے۔ جس میں عالمی سطح کا "امریکن فاؤنڈیشن ایوارڈ، مہاراشٹر فاؤنڈیشن ایوارڈ" قابل ذکر ہے۔ یہ سلسلہ اور آگے بڑھتا ہے اور سات ۷/ سالہ مختصر وقفہ کے بعد دوسرا مجموعہ کلام "کلوڑا اتلا ایکانت" ۲۰۱۲ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آدھمکا، اور اس مجموعہ کلام کو بھی ملکی سطح کے اہم اعزازات سے نوازا گیا۔ اور پھر سونے پہ سہاگہ یہ کہ مرکزی حکومت کے نیشنل بک ٹرسٹ نے دونوں مجموعوں کا باری باری ہندی اور انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ اس کے علاوہ عظیم نواز راہی صاحب کی مراٹھی تخلیق کے پس منظر میں ۲۵/ سے زائد مقالے مختلف ریسرچ اسکالروں کے ریاست مہاراشٹر کی یونیورسٹیوں میں پیش کیے۔

ایک غیر مراٹھی فنکار کا دوسری زبان میں بلندیوں کو چھونا معاشرہ کے لئے باعث فخر ہے، جبکہ معاشرہ آج علمی فقدان سے گزر رہا ہے، اور دوسری طرف عظیم نواز راہی صاحب جیسے تہذیب و تمدن کے علم بردار نے مراٹھی زبان بولنے والوں کو اُردو کا چسکا لگایا۔ زیر تبصرہ کتاب "پودا میرے آنگن کا" عظیم نواز راہی کا اردو کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ جس طرح سے اُن کا منفرد اندازِ نظامت ہے اُسی طرح سے اُنہیں مراٹھی کی نثر میں بھی مہارت حاصل ہے۔ ڈاکٹر راحت اندروی صاحب اپنے مضمون بعنوان "سنگ لاخ زمینوں سے اُگا پودا" میں رقمطراز ہیں۔ " راہی کی طرح لوگوں کی قدر دانی، اُن کی کے فن کی پذیرائی اور ان کی خدمات کا خاطر خواہ اعزاز ہو، یہ ہمارے معاشرے اور شعر و ادب کے لئے مسعود و مبارک ہے، میں یہ چند الفاظ بطور ہدیہ خلوص، کثیر جہتی صلاحیتوں کے مالک اُس فنکار کے اعزاز و اکرام میں پیش کر رہا ہوں جو اردو اور مراٹھی دونوں زبانوں کے فنکاروں کے عزیز ہیں، اور دونوں زبانیں جنہیں عظیم نواز راہی کے نام سے جانتی ہیں۔"

اُردو اور مراٹھی میں پُل کا کردار نبھانی والی شخصیت عظیم نواز راہی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر بشیر بدر یوں رقمطراز ہیں۔ "اُردو اور مراٹھی ادب میں پُل کا کردار نبھانے والی شخصیتیں بہت کم ہیں، عظیم نواز راہی کا تخلیقی سفر قومی یکجہتی کی علامت ہے، اُردو اور مراٹھی کے اس راہ گیر کو قدم بہ قدم عزت و شہرت کے سایے ملتے رہیں اور پودا گھنے درخت کی شکل اختیار کرے۔

دُعا کرو کہ پودا سدا ہرا ہی لگے　　　اُداسیوں میں بھی چہرہ کھلا کھلا ہی لگے

زیر نظر کتاب "پودا میرے آنگن کا" جس کو ۲۳/ قلمکاروں نے عظیم نواز راہی کی بے لوث محبت اور غیر مفادی تعلقات کی بنا پر اپنے اپنے اندازِ تحریر کے گلدستوں سے سجایا ہے۔ جس میں سرِ فہرست نام جناب ڈاکٹر راحت اندوری، ڈاکٹر بشیر بدر، نعیم اختر خادمی، ابرار کاشف، نعیم فراز اکولہ، منظور اعجاز جوش، عبدالصمد صاحب، ریاض احمد دیشمکھ دوحہ قطر، لطیف حیراں، سبحان انجم کھامگاؤں، عبد الرفیق قمر، وقار صدیقی، غنی غازی، ابراہیم خان افسوس، عبدالرفیق سیٹھ قریشی، ڈاکٹر محمد اسرار، ضیاء زخمی، ڈاکٹر قاضی رفیق راہی، سمادھان ساوڑے، ساجد خان پٹھان، محمد سلیمان کوثر، احتشام اشرف خان گوہر، اور ناچیز مفتی حبیب الرحمٰن ندوی۔ مضامین کے بعد مصنف کا جوطرۂ امتیاز ہے غزلیات سے پیشتر نعت النبی ﷺ سے شروعات کی گئی، تین نعتیں ۳۸/ اڑتیس غزلیں، ایک ارگیت، زندگی کے منفرد رنگ، کے تحت مصنف نے اپنے لخت جگر مرحوم بیٹے "اسرار" کی "روداد ایک المناک سانحہ کی" نظامت کی کھیتی کی فصل،

منقبت اور آخر میں سلام پر کتاب کا اختتام کیا ہے۔ کل ملا کر کتاب ایک بہترین دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے لہذا اس کتاب کا مطالعہ کی میز پر ہونا ناگزیر بن جاتا ہے۔ اس کتاب کو مندرجہ بالا پتے سے حاصل کیا جا سکتا ہے!!!! اس کتاب کی قیمت ہے **۳۰۰**/روپے اور **ملنے کا پتہ**: ساحل ہاؤس جعفر آباد محلّہ، مقام پوسٹ ساکھر کھیڑا تعلقہ سند کھیڑ راجہ، ضلع بلڈانہ۔ 443202

کتاب کا نام: غزل اور فنِ غزل مصنف: ظہیر غازی پوری

مبصر : ایم۔ نصر اللہ نصر (09339976034)

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں عالمِ گیتی میں آنے والے ادبا و شعرا ایک ایک کر کے ہمیں داغِ مفارقت دیئے جا رہے ہیں۔ یہ اردو ادب کے لئے اچھا شگون نہیں۔ اسی دہائی میں جنم لینے والوں میں ظہیر غازی پوری بھی ہیں جن کی ادبی خدمات سے اردو ادب مالا مال ہے۔ ان کی تصنیفات میں تثلیث فن' الفاظ کا سفر' آشوبِ نو' کہرے کی دھول' سبز موسم کی صدا' دعوتِ صد نشتر' لفظوں کے پرند' نوائے خاموش' کیسے تقسیم کرو گے تاریخ کو (شعری تصنیفات) اور نثری تصنیفات میں مطالعۂ اقبال کے بعض اہم پہلو' اردو دوہے ایک تنقیدی جائزہ' بہار اور جھارکھنڈ کے اہم قلمکار اور غزل اور فنِ غزل شامل ہیں۔ جن کے معیار' مفاد اور مرتبے سے انکار نہیں۔

زیرِ مطالعہ کتاب ''غزل اور فنِ غزل'' موصوف کی ایک بہتریں کتاب ہے جس سے نئی نسل کافی فیضیاب ہو سکتی ہے۔ اس کتاب میں کل گیارہ عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ جن میں جدید اردو غزل کا دوسرا رخ' غزل ایک جاندار صنف سخن' نیم وحشی صنف شاعری' اکیسویں صدی کی غزل' نئی غزل _ اجتہادیت کی غماز' صنفِ غزل پر مسلسل یلغار' نئی غزل میں تخلیقی لفظ و بیان' اشعار غزل میں عروضی و فنی معائب' ایطا کوئی بڑا عیب نہیں' اردو غزل میں ردیف و قوافی کے مسائل اور غزل چہرہ آئینہ در آئینہ شامل ہیں۔ صرف عنوانات سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب اہل ادب اور علم و فن کے متلاشیوں کے لئے کس قدر اہم اور مفید ہے۔ جدید اردو غزل کا دوسرا رخ کے حوالے سے موصوف رقمطراز ہیں:

''جدید غزل نے فکر و خیال کی نئی سمتیں' نئی جہتیں اور نئے اسلوب تلاش کیے ہیں۔ لفظوں کو نئی معنویت عطا کی ہے۔ تراکیب کو نئے افکار و عوامل سے ہم آہنگ کیا ہے۔ نئے پیکر تراشے ہیں اور نئی علامتوں کی طرفگی سے ذہن و شعور کو سرشار کیا ہے۔'' (ص۔۱۲)

مذکورہ بیان سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ ہر شاعر کے حق میں درست نہیں۔ ہاں جدید دور میں شعرا کی یہ کوشش ضرور رہی ہے کہ نئی غزل روایتی غزل سے مختلف ضرور ہو۔ اس میں نیا پن ہو۔ انداز نیا ہو۔ اسلوب میں جدت ہو۔ بیان میں انفراد و امتیاز ہو۔ رنگ میں یکسانیت نہ ہو۔ جس میں تھوڑی بہت کامیابی ضرور ملی ہے۔ لیکن معیار کی تلاش اب بھی جاری ہے۔ یہ ایک تنبیہہ ضرور ہے کہ نئی صدی کی نئی غزل اپنی شناخت بنائے۔ جس کے لیے شعرا ہر طرح کی کوشش میں لگے ہویے ہیں۔ کچھ تو کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ''غزل ایک جاندار صنف سخن'' کے عنوان پر بحث کرتے ہوئے موصوف یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں: ''روایت اور کلاسیکیت ہی ہر دور میں نئے رنگ و آہنگ' نئی شکل و شباہت اور پُرکشش لب و لہجہ میں منتقل اور متشکل ہوتی رہی ہے۔'' (ص۲۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ناقدوں نے نیا پن کے نام پر قدیم غزل' ترقی پسند غزل' جدید غزل' اور اس کے بعد اینٹی غزل' کالی غزل وغیرہ کے نام سے غزلوں کو منسوب کیا ہے۔ جن کی معنویت اور مقصدیت کو تلاش کرنا ممکن نہیں۔ ترقی پسندی' جدیدیت' تجریدیت اور مابعد جدیدیت یا ساختیات و تشکیلیت سب ایک لیبل کے سوا کچھ نہیں۔ شعر و ادب کا سفر جاری ہے اور جاری رہے گا۔ جدت اور نیا پن اس کا تقاضا ہے مگر حصارِ ادب میں۔ اس لئے ظہیر صاحب کی رائے سے اتفاق کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مختصر یہ کہ پوری کتاب معلومات کا خزانہ ہے۔ ایک ایک جملہ قیمتی اور گرہ میں باندھ لینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ چونکہ وہ ساٹھ ستر برسوں سے شعر و ادب لکھ پڑھ رہے ہیں اس لیے ان کے تجربے اور آرا سے گریز کرنے کے بجائے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ کتاب بہت اچھی ہے خصوصی طور پر نئی نسل کے مطالعے کے لیے تو انتہائی ضروری ہے۔ اللہ انہیں حیات دے کہ ایسی اور کتابیں منظرِ عام پر آئیں آمین۔ اس کتاب کی قیمت ہے **۲۰۰**/روپے اور ملنے کا پتہ۔ ظہیر غازیپوری۔ بیت الادب۔ ہاشمیہ کولونی۔ ہزاری باغ۔ 825301 (جھارکھنڈ)

کتاب کا نام : مونسِ سخن (رباعیات کا مجموعہ)

شاعر : عبدالمتین جامیؔ۔ تبصرہ نگار: ایم۔ نصر اللہ نصر (09339976034)

عبدالمتین جامیؔ دنیائے علم ادب میں اپنی شہرت اور علمیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ اردو بستیوں سے دور ایک غیر اردو ماحول کے پروردہ ہیں مگر اردو سے ان کو اس قدر انسیت ہے کہ نثر و نظم دونوں میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ اردو کے لئے ان کی یہ لہو پاشی بے شک قابلِ رشک ہے۔ اردو زبان سے انہیں والہانہ عشق ہے اور شعر و ادب سے تو جنون کی حد تک چاہت و محبت ہے۔ اردو کی وہ کون سی صنف ہے جس میں انھوں نے اپنے جوہر نہیں دکھایے۔ بقول پروفیسر کرامت علی کرامت:۔ ''عبدالمتین جامیؔ عجیب و غریب مخلوق ہیں۔ شاعری' تنقید' افسانہ' ناول' ڈراما' منظوم تمثیل' خاکہ' انشائیہ' جاسوسی ادب' اڑیا اور بنگلہ کے ادب عالیہ کا اردو ترجمہ' غرض ادب کا کون سا قابلِ ذکر شعبہ ہے جو ان کی تخلیقی اور فنی دسترس سے باہر ہے''

بے شک عبدالمتین جامی نے اردو ادب میں ایک آل راؤنڈر کا کام کیا ہے۔ غزل' آزاد غزل' غزل نما' نظم' آزاد نظم' نثری نظم' ترائلے' سانیٹ' دوہا' دوہا غزل اور رباعی کے علاوہ بھی دیگر تخلیقات ان کے خامۂ گہربار سے نکل کر رسائل و اخبارات کی زینت بن چکی ہیں۔ (عبدالمتین جامی کو بلاشبہہ ایک ہمہ جہت Versatile شخصیت کا مالک قرار دیا جا سکتا ہے۔ کرامت علی کرامت)۔

''مونسِ سخن''ان کی رباعیوں کا دوسرا مجموعہ ہے اس سے پہلے رباعیات کا پہلا مجموعہ ''بساطِ سخن'' منظرِ عام پر آ کر داد و تحسین کے کلمات سے سرفراز ہو چکا ہے۔ نیز ایک غزلیہ مجموعہ ''نشاط آ گہی'' کی بھی کافی دھوم رہی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ جامی صاحب کو رباعی کہنے میں کافی مہارت حاصل ہے تو مناسب نہیں ہوگا بلکہ ان کو ہر صنف ادب پر دسترس حاصل ہے ۔ ہاں موصوف کا ذہن ان دنوں رباعی کہنے کی طرف زیادہ مائل ہے۔ یہ ان کا شوق نہیں بلکہ انھوں نے اچھی اور کامیاب رباعیات کہی ہیں اور ہر موضوع پر کہی ہیں۔ جن میں اخلاقیات' سماجیات' سیاسیات' دینی و مذہبی' فلسفۂ حیات' اصلاحی' پند و نصائح سے معمور اور دیگر موضوعات پر بھی رباعیاں زیرِ تحریر لا کر اپنی علمی و ادبی صلاحیت کا مظاہرہ خوب کیا ہے۔ چند رباعیات ملاحظہ کریں:

ہر شے کا فنا ہونا مقدر میں ہے	ہر بات تو اللہ کے دفتر میں ہے
ہر شخص کو مرنا ہے یقیناً اک روز	پھر بھی وہ تلذذ کے سمندر میں ہے

☆

ہر چیز کو تخلیقِ خدا کہتا ہوں	تخلیق کو خالق سے جدا کہتا ہوں
یہ بات حقیقت پہ ہے مبنی جامؔی	جو کچھ بھی میں کہتا ہوں بجا کہتا ہوں

☆

حق اپنے زمانے میں ہوا ہے مفقود	ٹھوکر میں جو پتھر تھا ہوا ہے مسجود
زر ہی ہوا انسان کا جب نصب العین	زر ہی ہوا گو یا کہ سبھی کا معبود

یہ ایک حقیقت ہے کہ موصوف کو رباعی گوئی پر قدرت حاصل ہے ۔ اب تک ہزاروں کی تعداد میں وہ رباعیاں کہہ چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ زیرِ مطالعہ مجموعے میں تقریباً 465 منتخب اور منفرد رباعیات شامل ہیں جو قاری کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ جن میں موضوعات کی بھر مار ہے۔ مذکورہ موضوعات کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی' تصوفانہ' عارفانہ' طنزیہ و مزاحیہ اور عشقیہ مضامین پر رباعیات موجود ہیں۔ ان کی رباعیات میں وسعت بھی ہے اور گہرائی و گیرائی بھی۔ ذات کی بات ہے اور کائنات کا تذکرہ بھی۔ اسلوب و بیان بھی دلکش اور جاذب نظر ہیں۔ مثالیں ملاحظہ کریں؛

میں کرب کے زنداں میں ہوا ہوں محبوس	اک ٹاٹ کی گدڑی میں ہوا ہوں ملبوس
دنیا سے یہ کہتا ہوں کہ معصوم ہوں میں	ہے کون جو کرتا مرے غم کو محسوس
سب لوگ یہ کہتے ہیں سیاست ہے غلیظ	طاقت کی انتہا کی چاہت ہے غلیظ
ہے سب کو مگر پھر بھی قیادت کی چاہ	آتی ہے جو اس راہ پہ دہشت ہے غلیظ

ایسا نہیں ہے کہ جامی صاحب کو اب مزید مطالعے اور غور فکر کی ضرورت نہیں۔ علم تو سمندر ہوا کرتا ہے اور انسان زندگی کی آخری سانس تک سیکھتا رہتا ہے۔ اس لیے موصوف اس سے بھی اچھی اور سلیس رباعیاں کہنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ مصرعوں میں روانی اور فصاحت اور آ سکتی ہے۔ موضوعات میں تنوع کی فراوانی کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ سنگ گہر بن سکتا ہے۔ تابندگی اور تازگی میں ندرت آ سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ فی الحال ان کی رباعیات میں ان چیزوں کی کمی ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ ساری خصوصیات جامی صاحب کی رباعیات میں موجود ہیں۔ یہ باتیں صرف نکھار اور ندرت کے لیے کہی گئی ہیں اس لئے کہ تعداد کے تعاقب کے بجائے معیار کی تلاش شاعر کو بام شہرت عطا کرتی ہے۔ ''مونس سخن'' جامی صاحب کی رباعیات کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس میں منفرد رنگ و نکہت کے گلِ تازہ جلوہ نما ہیں۔ ہمیں مطالعے کی ضرورت ہے۔ کتاب بہت عمدہ اور دیدہ زیب چھپی ہے۔ سعید رحمانی نے اس کی ترتیب و تہذیب میں کافی محنت کی ہے۔ اللہ دونوں کو عمر خضر عطا کرے آمین۔ کتاب کی قیمت ہے ۱۰۶/ روپے اور شاعر کا پتہ: اردو بازار' پدما پور' کٹک ضلع اڑیسہ۔754200)

کتاب کا نام : آب رواں (شعری مجموعہ)

شاعر۔ ڈاکٹر کلب حسن حزیں مبصر۔ شمس افتخاری (08336067873)

میرے پیشِ نظر ''آب رواں'' ڈاکٹر کلب حسن حزیں کا ساتواں شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ایک حمد باری تعالیٰ' ایک نعت رسول اکرم' ایک منقبت شہیدانِ کربلا اور تقریباً ۱۸۶ غزلیں ہیں جن میں زیادہ تر غزلیں دامن کشِ دل ہیں۔ گرچہ ان کے کلام میں فنی نزاکتوں کا اہتمام نہیں ہے اور نہ ہی کلی طور پر عروض و بیان کی پاسداری ہے تاہم ان کے کلام میں پائے جانے والے موضوعات کی رنگارنگی' پاکیزگی اور ندرتِ فکر قارئین کو دائرۂ اثر سے باہر نکلنے نہیں دیتی۔ بیشک ان کی شاعری ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی ہے۔ وہ زندگی کے عارف ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ انہوں نے عرفانِ ذات کے مختلف النوع پہلوؤں کو انتہائی چابکدستی سے شعری پیکر عطا کیا ہے۔ ان کے اشعار میں زندگی دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں کیا کچھ نہیں ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق مضمر ہیں۔ جہاں خوش کن زندگی کی مسرتیں ہیں وہیں درد و غم کی کراہیں بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں نفرت کی شعلگی ہے وہیں رومان کی جلوہ گری بھی ہے۔ سب سے بڑی بات ان کی شاعری میں پاکیزگی ہے' وضعداری ہے' انسانیت کا درد ہے اور آدمیت کا درس ہے۔ چند اشعار بطورِ دلیل ملاحظہ فرمائیں:

ہو تکلیف جس سے جہاں میں کسی کو۔ نہ نکلے کبھی لفظ ایسا زباں سے

نہیں الفتوں کا صلہ چاہیے۔ بس ان کی نگاہِ وفا چاہئے

مثالِ شاخ گل لچک رکھتے ہیں ہم۔ دشمنوں کے سامنے تلوار ہیں ہم

وہ ہیں دنیا میں صاحبِ عظمت۔ پھول الفت کے جو کھلاتے ہیں

ڈاکٹر کلبِ حسن حزیں کی شاعری میں فلسفہ طرازی' ایمائیت کی جلوہ گری' تشبیہات کی دلکشی اور استعارات کی رنگ آمیزی نہیں ہے مگر ندرتِ فکر کی جولانی' ذخیرۂ الفاظ اور شعر کہنے کا سلیقہ ضرور ہے۔ ان کے یہاں طنز کی کاٹ بھی خوب ہے۔ مثال دیکھیے:

بات جب انعام کی آئی کبھی۔ اس نے خود کو ہی کیا ہے نامزد

نیک نامی کا انہیں تمغہ ملا ۔ کرتے رہتے ہیں حزیں جو کارِ بد

کتاب کافی پُرکشش اور لائقِ مطالعہ ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے جس سے باذوق قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین ہوسکتی ہے اور سابقہ کتابوں کی طرح اس کی بھی پذیرائی خوب ہوگی۔ اس کتاب کی قیمت ہے ۲۰۰/روپے اور رابطہ: سکراول' ٹانڈہ' امبیڈکرنگر (یو۔پی۔224190)

نام کتاب: رباعیات کے چار دیوان

شاعر: ڈاکٹر صابر سنبھلی   مبصر۔ توفیق احسن برکاتی (ممبئی)

ڈاکٹر صابر سنبھلی علمی و ادبی دنیا کا بڑا محترم نام ہے، وہ شاعر بھی ہیں، محقق بھی، عروض داں بھی ہیں، نصاب ساز بھی، استاذ بھی ہیں، مربی بھی۔ تحقیق اور شاعری ان کے ادبی مشاغل میں سرفہرست ہیں، تین درجن کتابوں کے مصنف و مولف و مترجم ہیں، شاعری میں استاذ شاعر مانے جاتے ہیں، بالخصوص نعتیہ شاعری ان کے قلم کی آبرو ہے اور اس پر انھیں بے پناہ فخر ہے۔ ۲۰۰۸ء میں ان کا نعتیہ دیوان ''دیوان صابر'' چھپا۔ ۲۰۱۱ء میں ''بہارستان سخن'' کے نام سے بہاریہ دیوان طبع ہوا۔ ۲۰۱۳ء میں ''دواوین رباعیات'' مرتب کر کے شائع کیا۔ ۲۰۱۴ء میں خالص حمدیہ مجموعہ ''محامد رب'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اور اب ۲۰۱۵ء میں ''رباعیات کے چار دیوان'' کا یہ گراں قدر تحفہ ان کے شعری و ادبی مقام کو استناد عطا کر رہا ہے۔

رباعی اصناف شعر میں انتہائی مشکل صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ چار مصرعی نظم چوبیس اوزان میں تحریر کی جاسکتی ہے اگر چہ اس کے الگ الگ مصرعے چار علاحدہ علاحدہ اوزان میں ہوں، جناب سحر عشق آبادی نے ۲۴/اوزان میں ۱۲/اوزان کا اور اضافہ کیا ہے۔ زیر نظر دیوان میں ''چار در یک'' کی حقیقت بھی موجود ہے اور ۲۴/اوزان کے علاوہ ۱۲/اوزان میں الگ تین رباعیات شامل ہیں اور ہر مصرعے کے نیچے اوزان بھی درج ہیں، یہ اوزان بہت زیادہ رواں نہ ہونے کی وجہ سے مشکل در مشکل پیدا کرتے ہیں اور ان میں رباعی کہنا انتہائی دشوار گزار مرحلہ تھا لیکن صبر کرنے والوں کے لیے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے اور صابر سنبھلی اس مقام پر اسم با مسمیٰ ثابت ہوئے ہیں، جو بہت بڑا کمال ہے۔

''رباعیات کے چار دیوان'' میں مجموعی طور پر ۲۵۲/رباعیات شامل ہیں جن کے ۱۰۰۸/مصرعے بنتے ہیں اور اشعار کی تعداد ۵۰۴/مکمل ہوتی ہے، یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر موصوف نے اپنی فکر و اجتہاد کا کتنا لہو خرچ کیا ہے، ان کی اب تک کی مطبوعہ رباعیات کی تعداد ۵۸۷/ہے اور غیر مطبوعہ ۱۱۴/ہے جو فن رباعی گوئی میں ان کی مہارت کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے، لیکن صرف یہی کام اہمیت کا حامل نہیں ہے، بلکہ ان رباعیات میں انھوں نے انوکھے موضوعات کی جو کھیتیاں لگائی ہیں، اور فکر و فن کی جو موتیاں پروئی ہیں ان کی درجہ بندی اس سے بھی زیادہ اہم اور قابل قدر ہے۔ دوواین رباعیات میں مذہبی امور زیادہ زیر بحث آئے تھے، لیکن اس کتاب میں چند حمدیہ و نعتیہ رباعیات ہیں اور کثیر تعداد میں اخلاقیات، حکمت و موعظت، عشق و عرفان، خمریات اور غم دوراں کو خو، بو سمیٹے ہویے ہیں، اس لحاظ سے بھی ان رباعیات کو انفرادیت حاصل ہے کیوں کہ یہ اسباق ہر دور کی ضرورت ہیں اور عہد رواں میں تو اس کی افادیت فزوں تر ہے۔ اور یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ شعور و آگہی کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرتی اور اخلاقیات کے بغیر عزت نہیں حاصل کرتی۔ ڈاکٹر صابر سنبھلی نے انھیں مقاصد کا لحاظ کرتے ہوئے یہ رباعیات تحریر کی ہیں اور نوجوان نسل کو بامراد اور باوقار زندگی گزارنے کا سبق آموختہ کرایا ہے اور اس میں وہ بے طرح کامیاب ہیں۔

اس مجموعے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں موجود رباعیات میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں یا احوال زمانہ کے جو بھی مناظر بیان کیے گئے ہیں وہ قدم قدم پر ہمارے آس پاس نظر آتے ہیں، اس لیے ان کی تفہیم ذرا بھی مشکل نہیں ہے، گویا منظر نگاری، کردار نگاری اور احوال نگاری بے حد واضح اور قابل فہم ہے، نہ ایہام ہے نہ ایطا، نہ ابہام، نہ ژولیدگی۔ ورنہ بعض شعرا کی شاعری میں تو ایسے تجریدی افسانے ملتے ہیں کہ ابلاغ و اظہارِ معنیٰ انتہائی مشکل ہو جاتا ہے اور مفہوم شاعر کے بطن میں ہی اٹکا رہتا ہے۔ صابر سنبھلی نے جدیدیوں کی فلسفیانہ کردار کشی سے خود کو بچایا ہے اور اپنی شاعری میں ایسی کوئی بات پیش نہیں کی ہے جو محض تنقید و نشتر کا کام دے بلکہ جہاں کہیں نشتر چبھویا ہے فوراً اس پر مرہم زنگار بھی رکھ دیا ہے، طنز ہے تو ملاحت کے جمال سے آراستہ۔ چند رباعیات پیش خدمت ہیں:

ہو بزم شیاطین کا جو حاضر باش ۔ کرتا نہیں اللہ کا جو فضل تلاش
دولت نے جسے کر دیا ہونا کارہ ۔ انسان نہیں بلکہ وہ ہے زندہ لاش

☆

انداز ترے آج عدو کے کیوں ہیں ۔ محکوم جو تیرے ہیں وہ بھوکے کیوں ہیں
کہتی ہے رعایا تو محافظ تجھ کو ۔ چھینٹے ترے دامن پہ لہو کے کیوں ہیں

☆

کہتے ہیں انھی لوگوں کو انسان نواز ۔ جو دیتے ہیں ہر خورد و کلاں کو اعزاز
افلاس و امارت کا نہیں کرتے خیال ۔ اک جیسے ہیں ان کے لیے محمود و ایاز

مذکورہ رباعیات انتخاب نہیں ہیں، بلکہ چند صفحات کی ورق گردانی سے عجلت میں یہاں درج کی گئی ہیں ورنہ یہاں کی ہر رباعی انتخاب بن سکتی ہے اور کوئی نہ کوئی حقیقت پیش کرتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صابر سنبھلی کثیر المطالعہ ہیں، ان کی زندگی عمیق مشاہدات کی حامل ہے، ۷۴ برس کی عمر میں بھی وہ مطالعہ و مشاہدہ کے قطب مینار پر چڑھ کر دنیا کو ملاحظہ کر رہے ہیں اور ان کی تصویریں ارباب کمال کے روبرو پیش کر رہے ہیں، جسے دیکھنے والوں کو دانش وری کا ایک جہان دکھائی دیتا ہے۔ درمیان میں چند رباعیات عشقیہ پیکر تراشی سے مزین موجود ہیں، یہاں بھی صابر سنبھلی کا لب و لہجہ مسحور کن ہے اور رباعی کا لفظ لفظ حسن و عشق کی بولی بولتا دکھائی دیتا ہے:

زلفوں کی گھٹاؤں میں قمر جیسا رخ ۔ چشمان پر از کیف لیے زیبا رخ

رخسار ولب و گوش بھی ہیں لاثانی۔ مہتاب کے چہرے کو ضیا دیتا رخ

''آم کے آم، گٹھلیوں کے دام'' مشہور محاورہ ہے، دیکھیں، کس ہنرمندی سے شاعر نے یہ محاورہ اپنی رباعی میں استعمال کیا ہے:

نادار کے، مجبور کے آجاؤ کام۔ اللہ تعالیٰ سے ملے گا انعام

دنیا کی نظر میں بھی بڑھے گی عزت۔ یہ آم کے آم، گٹھلیوں کے ہیں دام

حاصل کلام یہ کہ ''رباعیات کے چار دیوان'' پند و نصیحت کا ایک حسین گلدستہ ہے، عمدہ شاعری اور سبق آموز فکروں کا آئینہ ہے، اس میں زندگی کی ہلچل اور احوال زمانہ کی رنگت ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ ڈاکٹر صابر سنبھلی نے رباعیات کے آٹھ دیوان مکمل کر لیے ہیں جو ادبی دنیا میں ان کے شعری امتیاز کو مسلم الثبوت بناتا ہے اور شائقین ادب کو عمدہ تحفہ پیش کرتا ہے۔ کتاب کی قیمت ہے ۱۰۰ / روپے اور ناشر: شاعر بذات خود، سیف خان سرائے، سنبھل، یوپی

نام کتاب: کاسہ حُباب۔ شاعر: شیدا قادری میرٹھی
مبصر۔ توفیق احسن برکاتی (ممبئی)

بزرگ شاعر و صحافی محترم محمد حسین شیدا قادری میرٹھی شہر مالیگاؤں کے ان نمائندہ اشخاص میں سے ہیں جو ہر وقت قوم و ملت کی خدمت کا جذبہ اپنے دلوں میں جوان رکھتے ہیں۔ شیدا میرٹھی ہفت روزہ انوار مالیگاؤں کے بانی ایڈیٹر اور شیدا اردو ہائی اسکول، مدثر نذر پرائمری اسکول کے بانی و مہتمم ہیں، شعر و ادب سے لگاؤ زمانہ طالب علمی سے رہا ہے، ان کی تعلیم کا بیشتر وقت ممبئی کے اردو اسکول و کالج میں گزرا ہے، عروس البلاد کے ادبا و شعرا، اساتذہ و باذوق افراد سے بنائے گئے روابط اور علمی نشستوں نے ان کے فکر و فن کو خوب تابانی بخشی ہے، شیدا نے ابتدا میں کہانیاں بھی لکھیں، نثری مضامین تحریر کیے، دوران تعلیم ماہ نامہ ''جگنو'' کا اجرا کیا اور اس کے مدیر اعلیٰ ہوئے، تربیتی مشاعروں میں بھی شرکت کی، مالیگاؤں آنے کے بعد یہاں کے ادبی ماحول کا بھی اثر قبول کیا، اسی شہر کے معروف دینی ادارہ حنفیہ سنیہ کی نشاۃ ثانیہ کی غرض سے ستّر کی دہائی میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا، ربع صدی تک سنی جمعیۃ العلماء اور دارالعلوم حنفیہ سنیہ کی جنرل سکریٹری شپ ان کے ذمے رہی، مسلسل تیس برسوں تک بلاناغہ ہفت روزہ انوار نکالتے رہے اور دین و مذہب کے ساتھ ادب و صحافت کی خدمت کرتے رہے۔ بہت بعد میں جب اپنے علمی اداروں کی بنیاد رکھی تو تن من دھن سے انھیں بام عروج تک پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔ ان گزرے ہوئے اوقات میں علم و ادب، شعر و سخن سے اپنا قلبی و قلمی رشتہ استوار رکھا اور جو دل پہ بیتتی رہی، اسے شعری قالب میں ڈھالتے رہے۔ نعتیہ و غزلیہ شاعری کے علاوہ موضوعاتی نظمیں لکھیں اور اپنے مطالعے و مشاہدے کا عرق اشعار کی رگوں میں انڈیل دیا، جس کا اندازہ زیر نظر مجموعہ ''کاسۂ حباب'' کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''کاسہ حُباب'' دنیا کی بے ثباتی، خود فراموشی اور انسانی و اخلاقی قدروں کے زوال کا استعارہ ہے، دنیا بڑی تیزی کے ساتھ اپنا چولا بدل رہی ہے، انسانیت کا خون کرنے والے انسانیت کی دہائی دے رہے ہیں اور حیوانیت کا ننگا ناچ ہر سو ناچا جا رہا ہے، بے بنیاد آزادی اور مساوات مرد و زن کے نام پر خواتین کو آبرو باختگی پر ابھارا جا رہا ہے، جہاں شرم و حیا فقط لفظ بن کر رہ گئے ہیں اور بے حیائی اعلیٰ دماغوں میں سما چکی ہے، شیدا میرٹھی نے کتاب کا نام ان اشعار سے اخذ کیا ہے، حقیقت پر مبنی یہ دو شعر دیکھیں:

عورت کے ہاتھ میں ہے پیالہ شراب کا۔ وہ دور ہی نہیں رہا شرم و حجاب کا

دریا کو مانگنے کا بھی آیا نہیں شعور۔ الٹا لیے ہے ہاتھ میں کاسہ حُباب کا

آغاز کتاب میں شاعر کے احوال واقعی کے منفرد لب و لہجے کے نامور شاعر و ادیب بشر نواز کا نو (۹) صفحاتی مضمون شاعر کے فکر و فن کی گرہیں کھولتا ہے اور ان کے موضوعاتی تنوع کو نمایاں کر رہا ہے، مضمون کے اخیر میں بشر نواز لکھتے ہیں: ''شیدا کے مجموعۂ کلام کی سطر سطر اور صفحہ صفحہ الگ الگ جہانوں کی سیر کراتا ہے اور نئی نئی دنیاؤں سے متعارف کراتا ہے، اس کا ہر شعر اور ہر شعر کا ایک ایک حرف معنی اور بیان کی ایسی چاشنی فراہم کرتا ہے کہ قاری اس کی لذتوں میں محو ہو جاتا ہے۔ شیدا کی شاعری ماضی، حال اور مستقبل کی آئینہ دار ہے اور ہر دور میں زندہ رہنے والی شاعری ہے۔''

شیدا میرٹھی عشق مزاج شاعر ہیں اور عصری آگہی اور کرب خود کلامی بھی رکھتے ہیں، وہ ہر اس محل کو مسمار کر دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد نفرتوں اور لاشوں پر رکھی گئی ہو وہ قنوطیت پسند نہیں، ان کے یہاں امید و آس کی رعنائیاں ہیں، عزائم کی سختیاں ہیں اور یہ حوصلہ اور احتیاط بھی قابل ستائش ہے، ملاحظہ کریں:

نہ گھبراؤ یہ گرداب بلا سے ہم نبٹ لیں گے۔ ہمیں طوفاں میں کشتی سے اتر جانا نہیں آتا

ہم اپنے دل میں رکھتے آئے ہیں ذوق طلب شیدا۔ جنون عشق میں حد سے گزر جانا نہیں آتا

البتہ چند اشعار میں مبالغے کا عنصر کافی زیادہ ہے، جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، مثلاً یہ شعر:

آدمی کیا ہے، فرشتے بھی فدا ہیں تجھ پر۔ ایک میں ہی نہیں ہر شخص ہے شیدا تیرا

امید ہے کہ یہ مجموعہ علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی کا اپنا حق ضرور وصول کرے گا، البتہ کتاب کی قیمت کچھ زیادہ ہے۔ قیمت ہے ۴۰۰ / روپے اور ناشر: شیدا ایجوکیشن فاؤنڈیشن، مالیگاؤں

نام کتاب۔ گل کدۂ صبح و شام (شعری مجموعہ)
شاعر۔ پروفیسر کرامت علی کرامت۔ مبصر۔ سعید رحمانی

ادبی منظر نامہ میں پروفیسر کرامت علی کرامت ایک ہمہ جہت شخصیت کے بطور متعارف ہیں۔ شعر و ادب، تحقیق و تنقید اور ترجمہ نگاری کے فن میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ریاضیات جیسے خشک موضوع کے پروفیسر ہونے کے باوجود ادب اور شاعری جیسی صنف لطیف پر انھوں نے جو گراں قدر اضافہ

کیا ہے وہ ہمیشہ تاریخ ادب کا حصہ بنا رہے گا۔

۱۹۶۳ء سے تا حال ان کی نو تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں جو شاعری، نقد و ادب، تحقیق اور ترجمہ نگاری پر مبنی ہیں۔ ''گل کدۂ صبح و شام'' ان کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے اور اسی سال جنوری ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ پر کچھ کہنے سے پہلے یہ بتادوں کہ پروفیسر کرامت نے سائنس اور ادب کو اس طرح ہم آمیز کیا ہے کہ سائنس بھی آرٹ کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ ایک طرح سے انھوں نے شیلے، پیٹر، اوجر، اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اس نظریئے کی توثیق کی ہے کہ ''سائنس جب جذبات کے ساتھ مل جائے تو وہ آرٹ بن جاتا ہے''۔

یوں تو مختلف اصناف سخن میں اپنی تخلیقیت کے خوش نما گل بوٹے کھلائے ہیں اور جس فن کو بھی چھوا ہے وہ ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ بن گیا ہے، اس کے باوجود بنیادی طور پر انھیں غزل کا شاعر ہی کہا جاسکتا ہے۔ علیم صبا نویدی بھی انھیں غزل گو شاعر تسلیم کرتے ہیں اور ان کی غزلوں اور محاسنِ شعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں ''کرامت علی کرامتؔ کی غزلوں میں جدیدیت مثبت پہلو لے کر ابھری ہے یعنی روایت کو زک پہنچائے بغیر ایک دھیمی سی کروٹ لے کر جدیدیت کی حد میں بہنے لگتے ہیں''۔

زیر نظر مجموعہ کل ۲۳۹ صفحات کو محیط ہے جس کی ابتدا منظومات سے ہوتی ہے۔ ان منظومات میں حمد باری اور نعت پاک کے علاوہ مختلف موضوعاتی نظمیں ہیں۔ اس کے بعد واسوخت، گیت، سہرا، رباعیات، منظوم خطوط، متفرق اشعار اور سب سے آخر میں ہم سخن فہم ہیں'' کے تحت مشاہیر ادب کی آرا شامل ہیں۔

اس میں شامل غزلوں کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ کہیں تمناؤں اور خوابوں کی شکستگی ہے تو کہیں ماضی کی بازیافت میں محو نظر آتے ہیں۔ غزلوں میں جمالیات کی شبنمی ٹھنڈک کا احساس بھی ہوتا ہے اور حالات کے تپتے ہوئے صحرا کی تمازت بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ کہیں مذہبی رنگ بھی نظر آتا ہے جو ان کی فکری طہارت کی دلیل ہے۔ کہیں کہیں راست بیانیہ سے کام لیا ہے تو کہیں استعاراتی پیرایہ اپنایا ہے۔ مختلف موضوعات کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کے چند ملے جلے اشعار پیش ہیں۔

ان کے دھانی قد و قامت کے طفیل۔ کشتِ امید لہک اٹھی ہے

روز ازل سے تیرہ نصیبی کا ہوں شکار۔ سورج ہے اور پھر بھی گماں ہے کہ رات ہے

یہ دہشت، یہ وحشت ہے کس کام کی۔ یہ گندی سیاست ہے کس کام کی

درندوں کی صفت آئی ہے جب سے۔ پسند انساں کو خوں کا ذائقہ ہے

یہ اشعار راست بیانیہ کے عمدہ نمونے ہیں ان کا استعاراتی پیرایۂ اظہار بھی ملاحظہ ہو۔

بہے میری آنکھوں سے یوں اشک غم۔ کہ لفظوں کے کپڑے بھی گیلے ہوئے

اڑتا رہا آکاش پہ جذبوں کا فرشتہ۔ لفظوں میں اترتی رہی معنوں کی پری بھی

مختصر یہ کہ انھوں نے اپنے دلی جذبات کی ترسیل کے لئے کبھی غزل تو کبھی نظم، کبھی رباعی تو کبھی گیت کو وسیلہ بنایا اور ہر مقام پر اپنی انفرادیت کے خوش نما نقش بھی مرتب کیے۔ غرض کہ مجموعے میں شامل سبھی تخلیقات فن کے اعلیٰ مدارج پر ہیں جو اہل ادب کے ذہن و دل پر دیرپا اثرات مرتب کریں گی۔ انھیں کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔

اردو زباں کی شکل میں زندہ رہوں گا میں۔ یوں میں نشانِ گنگ و جمن چھوڑ جاؤں گا

اس کتاب کی قیمت ہے ۱۵۰ روپے ملنے کا پتہ۔ کامران پبلی کیشن۔ دیوان بازار کٹک۔ 753001 (اڑیسہ)

کتاب کا نام۔ شورِ تنہائی (شعری مجموعہ)

شاعر و ناشر۔ رمیش تنہاؔ مبصر۔ عبدالمتین جامیؔ

رمیش تنہاؔ کا تعلق ہریانہ سے ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں۔ تعلیم کے اعتبار سے انگریزی ادب میں پوسٹ گریجویٹ ہیں۔ لیکن اردو زبان کی شیرنی نے ان کو اپنی طرف متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بھی کر لیا۔ انھوں نے اردو زبان کے کئی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ غزلیں، رباعیاں، تری بینیاں، ماہئے اور ہائیکو کے اس مجموعے میں موصوف کی رنگارنگی اور کامیاب طبع آزمائی قابل تذکرہ ہے۔

موصوف کا یہ تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ قبل ازیں 'حرف تنہا' اور 'تیسرا دریا' کے نام سے دو کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں کئی انعامات سے نوازا گیا ہے۔ اپنے منفرد اندازِ بیان کے لئے اردو حلقے میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ موجودہ کتاب میں کئی اساتذۂ فن نیز مشاہیرِ شعر و ادب کی آراء اس بات پر دال ہیں کہ وہ اردو دنیا میں کس قدر مقبول و معروف ہیں۔

موصوف کی شاعری میں نہ تو لفظیاتی ابہام ہیں اور نہ ہی معنویاتی۔ آپ کے بیانیہ انداز میں سادگی ہے جو سہل ممتنع کے زمرے میں شمار کی جاسکتی ہے۔ رباعیات بھی فنی لحاظ سے بے داغ ہونے کے علاوہ فکر و عمل کو دعوت دیتے ہیں۔

ان کے یہاں پختہ کلامی موجود ہے جس کی بنا پر ان کے اشعار سیدھے سماعت سے گزر کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ بکل اتساہی کے بموجب ''آپ کے یہاں پختگی اور برجستگی کے ساتھ نرم آنچ کی فکر سے بے حد متاثر ہوا۔ آپ کے کلام میں روایت کے احترام کے ساتھ تازگی اور جدّت کا بھی اہتمام ہے۔''

سعید رحمانی کہتے ہیں ''اشعار تفہیم کی ایک خاص سطح پر قائم رہ کر براہ راست دل کی گہرائیوں میں اترتے محسوس ہوتے ہیں۔''

بابا سائیں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے لکھا ہے کہ ''کلام پڑھا تو اندازہ ہوا کہ آپ کی تخلیقی صلاحیت آپ کو بہت اوپر لے جایے گی اور اردو شاعری کو عمدہ غزلیں اور نظمیں ملتی رہیں گی''۔

رمیش تنہاؔ کی غزلوں میں عرفانِ ذات اور خودیابی کا جو احساس کارفرما نظر آتا ہے وہ شاید ہی ہم عصر کسی شاعر کے کلام میں مل پائے۔ موصوف کی غزلوں

کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

چھیڑ تنہائی سے سناٹوں کی رہتی ہے مدام۔ خود اپنے ہی وجود کے مشاہدے کو ہی سہی
ایک شہنائی سی بجتی ہے سدا غاروں میں۔ یہ کم ہے کیا کہ زیست نے مجھے تجھے چنا تو ہے

ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے:

تنہائی سے کچھ بات بھی ہو جاتی ہے۔ کچھ ان سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے
کچھ اپنے بھی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ کچھ پرسشِ حالات بھی ہو جاتی ہے

ان کی رباعی کی سادگی میں پرکاری ملاحظہ کرنے کے بعد ان کے اس ماہیئے کو لیجئے اور ان کی سادگیٔ بیان کی تعریف کیجیے کہ:

اک ہاتھ سے دیتا ہے / دوجے ہاتھ سے وہ / پھر لے بھی لیتا ہے

''رمیش تنہا'' کی شاعری سے مکمل آگہی کے لئے ''شورِ تنہائی'' کا مطالعہ ضروری ہے۔ کتاب کا یہ نام ہی جدت پسندی کی ایک نئے اسلوب کی پہچان بن جاتا ہے۔ ملنے کا پتہ: راج کمار کوشک، ڈی 102۔ ورندان گارڈن، سیکٹر 12۔ پلاٹ نمبر 10۔ دوارکا۔ نئی دہلی۔

کتاب کا نام۔ شام ڈھلے (شاعری)
شاعر۔ محمد حسین کاوش   مبصر۔ عبدالمتین جامی

جواں فکر شاعر محمد حسین کاوش ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ ان کی جوان امنگوں کو جیتا جاگتا نمونہ انہی کی پہلی کاوش ''شام ڈھلے'' میں شامل ان کی غزلیں ہیں۔ ان کی غزلوں میں جوانی کا جوش وخروش اور لا ابالی پن کی تصاویر جا بجا نظر آتی ہیں۔ اتنی کم سنی میں تجربات کے اتنے سارے مراحل طے کر لئے ہیں کہ ہمیں تعجب ہوتا ہے۔ مصوری کی دنیا میں انھوں نے بہت نام کمایا ہے۔ مختلف آرٹ گلیریوں میں ان کی آرٹ کی نمائش ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ اٹلی میں موجود ایک آرٹ اکاڈمی سے بھی ان کو توصیفی سند مل چکی ہے۔ اب شاعری کی دنیا میں بھی ''شام ڈھلے'' کے ساتھ ان کا قدم رکھنا بھی غالباً ان کے قارئین کو عجائبات کی دنیا میں لے جا چلے گا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے بارے میں لکھتے ہوئے ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے ان کو بحور و اوزان سکھانے میں اپنا وقت صرف کیا۔ ایسے ہی عروض دانوں میں عبید اعظم اعظمی بھی شامل ہیں۔ موصوف کی شاعری رومانیت کی حسین وادی کی سیر کراتی ہوئی جب حقیقت کی دنیا کی طرف مراجعت کرتی ہے تو ہمیں ایک ایسی دنیا سے سابقہ پڑتا ہے جہاں خود غرضیاں، غیر انسانی حرکات، غریبی، بھوک اور پیاس سے ہمکنار لوگوں کا جم غفیر نظر آتا ہے ہمیں نئے تجربوں سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔ اس طرح کے اشعار ملاحظہ فرمایئے:

وہی بتائے گا چھت کی اہمیت کیا ہے۔ وہ جس کے سر پہ سائباں نہیں ہوتا
اس دوانے سر پھرے سے آگ بھی لپٹی رہی۔ سوکھے دھاگے کے سرے پر جب تلک روغن رہا
سجی ہر سمت میلے میں کھلونوں کی دوکانیں تھیں۔ چھڑا کر ہاتھ ماں کا بھیڑ میں گم ہو گیا بچپن

محمد حسین کاوش گو کہ شاعری کے میدان میں نو وارد ہیں لیکن ان کے اشعار میں ڈوبے ہوئے تجربات و مشاہدات اس بات پر دال ہیں کہ وہ آگے چل کر ایک زمانے کو متاثر کریں گے۔ تاہم ان کی شاعری میں کہیں کہیں بحر و اوزان کے استعمال میں توازن نہیں پایا جاتا۔ بطور خاص بحر رمل اور بحر مضارع یعنی مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن اور مفعول، مفاعیل، مفاعیل فعولن کو گڈ مڈ کر کے اپنی اچھی شاعری کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں۔ یوں تو ان دونوں اوزان کو برتنے میں اچھے اچھے تجربہ کار شعرا بھی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ غالباً اسی کو کہتے ہیں ''بحر ہزج میں ڈال کر بحر رمل چلے''۔ لیکن چونکہ محمد حسین کاوش صاحب بہت ہی کمسن ہیں اور کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی ضروری ہے، ساتھ ساتھ خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ان کی راہ نمائی کی جائے۔ انھوں نے ''اپنی بات'' میں اس بات کا مشورہ بھی طلب کیا ہے، اس لئے میں نے یہ چند کلمات لکھے ہیں۔ صفحہ نمبر ۱۱۸ اور ۱۲۲ کی غزلوں میں یہی بات در آئی ہے۔ صفحہ نمبر ۱۳۶ رمیں مطلع، دوسرا شعر اور مقطع غلط ہے۔ باقی کے اشعار میں یہی خامی موجود ہے۔

کوئی تمھارے جیسا نظر بھی نہیں آیا۔ اور دل کسی سے ہم نے لگایا بھی نہیں ہے
اب ہاتھ کو بھی ہاتھ دکھائی نہیں دیتا۔ اتنا دھواں ہے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا
کہتا نہیں ہوں یار مگر سچ تو یہی ہے۔ اس کھیل میں تیرا بھی اہم رول رہا ہے
اس نے وطن میں لوٹ کے پوچھا نہیں کاوش۔ رکھتے تھے سوچ کر جو جوابات کیا کریں

باقی چند جگہ کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔ وہ قابل گرفت نہیں ہے۔ بہرکیف محمد حسین کاوش کی یہ پہلی کاوش لائق مطالعہ ہے۔ امید ہے شاعر موصوف اپنے اگلے مجموعہ کو اشاعت سے قبل کسی تجربہ کار استاد شاعر کو دکھا کر ہی طباعت کے مراحل سے گزاریں گے۔ ۔ مجموعے کی قیمت ہے ۲۰۰ روپے اور شاعر کا پتہ:۔ ۰۹ ر نوبل ٹاور۔ ۹۹ ر زکریا مسجد اسٹریٹ۔ ممبئی۔ 400009

طرحی غزل

سراج احمد سراج (مالیگاؤں)
موبائل۔ 9175910447

تحفتاً مجھ کو دیا درد کا لشکر کس نے   پیار سے گھونپ دیا سینے میں خنجر کس نے
تم کو معلوم اگر ہو تو بتا دو مجھ کو   قطرے قطرے سے بنا ڈالا سمندر کس نے
پوچھتا ہوں میں ہر اک سے یہ بتائے کوئی   ہائے جھلسایا مری قوم کا پیکر کس نے
کھول کر دل کو رکھے اور یہ پوچھے سب سے   ''دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے''
عشق نے، شوق نے، حالات نے، مجبوری نے   اے سراج آپ کو کر ڈالا سخنور کس نے

مہمان شاعر

محمد فہد پاشا

اس کالم میں شمولیت کے لیے مختصر سوانحی خاکہ، پانچ غزلیں اور تصویر ارسال کریں۔ مزید تفصیلات کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں۔:09437067585 (ادارہ)

اس شمارے کے مہمان شاعر ہیں کولکاتا کے ایک جواں فکر شاعر محمد فہد پاشا۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۳ء کو وہ ایک ایسے علمی خانوادے میں پیدا ہوئے جو شعر وادب کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ ان کے والد ماجد جناب حشمت کمال پاشا ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور ادبی دنیا میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ وراثت میں ملی اس شاعری کو فہد پاشا مزید جلا بخشنے میں مصروف ہیں۔ اگر مشقِ سخن اسی طرح جاری رہی تو جلد ہی فہد پاشا بھی اپنی شناخت بنالیں گے۔
اس وقت ان کی پانچ غزلیں میرے سامنے ہیں جن کی روشنی میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ روایت کی پاسداری انھیں عزیز ہے۔ غزلوں میں جمالیات کی چاشنی بھی ہے تو عصری حالات کی تمازت بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ وارداتِ قلبی کے برملا اظہار کے ساتھ حق گوئی اور بیباکی بھی ان کا شعار ہے۔ مطالعہ کے بعد قارئین خود اس کی تصدیق کرسکتے ہیں۔

مٹھی بھر غزلیں

رابطہ۔ محمد فہد پاشا۔ نواب واجد علی شاہ روڈ
گارڈن ریچ۔ کولکاتا۔ 700024
موبائل۔ 9804228315

انگلیاں مت اٹھا بتا کیا ہے
مجھ میں خامی اے ہمنوا کیا ہے
مجھ پہ پتھر اچھالنے والو
یہ بتاؤ مری خطا کیا ہے
بات سچی تھی کہہ دیا منہ پر
مجھ کو اس طور گھرتا کیا ہے
کوئی موتی نہ ہاتھ آیے گا
اس سمندر میں ڈھونڈتا کیا ہے
کن خیالوں میں کھویے رہتے ہو
روگ تم کو فہد لگا کیا ہے

☆

چاہتوں کے پھول سارے مر گیے
ہم خزاں کی سازشوں سے ڈر گیے
ہوش والے جس جگہ پہنچے نہیں
ہم جنوں والے وہاں اکثر گیے
حق نوائی کا صلہ ہی چاہیے
ہم صلیب و دار پر ہنس کر گیے
دھول کس نے جھونک دی ہے آنکھ میں
نور آنکھوں کا گیا منظر گیے
جن کی شاخوں پر لدے ہیں کچے پھل
ان درختوں پر فہد پتھر گیے

☆

ظرف اپنا آزمانا چاہیے
رنج و غم میں مسکرانا چاہیے
سب سے پہلے اپنے اندر ڈوب کر
بغض و نفرت کو مٹانا چاہیے
رازِ دل کھولوں کہاں کس سے کہوں
کچھ نصیحت دوستانہ چاہیے
ایک بھی مجرم سزا پاتا نہیں
مجرموں کا سر اڑانا چاہیے
ہے ضروری بربریت کے خلاف
دو قدم آگے بڑھانا چاہیے
جس کے دامن میں ہو سایہ امن کا
اے فہد وہ شامیانہ چاہیے

گلوں کی مجھ پہ بارش ہورہی ہے
نوازش پر نوازش ہورہی ہے
مری تنہائی کو پر نور کردیں
ستاروں سے گزارش ہورہی ہے
ادھر ہم عیش میں ڈوبے ہویے ہیں
پسِ دیوار سازش ہورہی ہے
پڑھے گا کون مجنوں کی کہانی
کہ لیلیٰ نذرِ آتش ہورہی ہے
خلوص و مہر سے خالی ہے دنیا
کہ بس زر کی نمائش ہورہی ہے
کروں کس طور اظہارِ غمِ دل
فہد آنکھوں سے بارش ہورہی ہے

آپ کو مسکرانا نہیں چاہیے
میرے دل کو دُکھانا نہیں چاہیے
گفتگو جتنی چاہے کرو آنکھ سے
شور دل میں مچانا نہیں چاہیے
شیشۂ دل نہ ہوجایے میلا کہیں
دل میں کینہ چھپانا نہیں چاہیے
صاف گوئی ضروری عمل ہے میاں
عشق میں کچھ چھپانا نہیں چاہیے
سانپ رکھتے ہیں جو آستیں میں یہاں
ان سے ملنا ملانا نہیں چاہیے
جو گزرتی ہے دل پر فہد ان دنوں
ہر کسی کو بتانا نہیں چاہیے

طرحی مشاعرہ

مصرعِ طرح ”دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے“ پر غزلیں پیش ہیں۔ اگلے شمارے کے لیے طرح نوٹ فرمائیں: ”درد کم ہے، تڑپ زیادہ ہے“ (اسد بھوپالی)
قوافی: زیادہ، ارادہ، سادہ وغیرہ۔ ردیف۔ ”ہے“۔ پانچ اشعار پر مشتمل آپ کی طرحی غزل ۳۰ نومبر ۲۰۱۶ء تک ہمیں مل جانی چاہیے۔ (ادارہ)

فیضی سمبلپوری (اڈیشا)

موبائل۔9430056678

کیا کہوں پار کیے سات سمندر کس نے
دل کے ساحل پہ مرے ڈالا ہے لنگر کس نے

تفرقہ اہلِ وطن میں کیا کس نے پیدا
قوم کی پیٹھ پہ یوں بھونکا ہے خنجر کس نے

خون کا دریا تھا اور شعلوں کی دیواریں تھیں
کس لیے چپ ہو؟ کہو دیکھا یہ منظر کس نے

ابرہہ ڈھاتا کیا کعبے کو گیا خود جاں سے
پہلے دیکھا تھا ابابیل کا لشکر کس نے

بے خودی، بے کلی ایسی تو نہ تھی فیضیؔ کبھی
”دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے“

عثمان افسر (کریم نگر)

موبائل۔9849291973

بند کوزے میں کیا ہے یہ سمندر کس نے
کردیا وقت کے حاکم کو بھی ششدر کس نے

ماسوا آپ کے کس کس کو ہوا ہے یہ نصیب
ہفت افلاک کو پل بھر میں کیا سر کس نے

کیا نظارا تھا وہ جانے جسے فوق الفطرت
چرخ پہ ٹکڑے کیے ماہِ منور کس نے

کچھ خبر بھی ہے کہ کیا ذاتِ نبی ہے لوگو!
دستِ بوجہل میں گویا کیے کنکر کس نے

رب کی تلقیں پہ بلا چوں و چرا اے افسرؔ
پیٹ پہ باندھ لیے شوق سے پتھر کس نے

محمد امجد سلیم (کریم نگر)

موبائل۔9550664623

شمعِ توحید کیا دل میں اجاگر کس نے
رکھ دیا نام مرا مست قلندر کس نے

لوگ ہیں خوفِ تصادم سے پریشان بہت
کھول رکھا ہے یہاں فتنوں کا دفتر کس نے

ہے بڑا کھوٹ زمانے کے توازن میں جناب
تول ایمان کا تولا ہے برابر کس نے

ایک ہلچل سی نظر آتی ہے چاروں جانب
”دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے“

رب کی مرضی پہ ہے موقوف مقدر امجدؔ
اس حقیقت کو کو کہا جھوٹ سراسر کس نے

قدیر احمد قدیر (ہلکوٹی کرناٹک)

موبائل۔9980208578

آنکھ کھولی تو بدل ڈالا یہ منظر کس نے
صبحِ کاذب کو کیا پھر سے منور کس نے

کور بینی سے تو ہوتا نہیں رنجیدہ میں
یوں کھلی آنکھ سے دیکھا کہو خاور کس نے

فکر کے موتی نفاست سے اٹھالاتے ہیں
ان خیالوں کو بنایا ہے شناور کس نے

جس کی اک چوٹ سے رگ رگ میں مچی ہے ہلچل
”دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے“

اس نے پوچھا ہے قدیرؔ آج یہ معصوم سوال
تیری آنکھوں کو کیا اشکوں کا ساگر کس نے

شہزاد اشرفی (پٹنہ)

موبائل۔9308229162

یاد آ آ کے جگایا مجھے شب بھر کس نے
مجھے بیتاب کیا دل کو دکھا کر کس نے

جن کے ہاتھوں میں کتابوں کی ضرورت تھی بہت
انھیں بچوں کو دیا آکے یہ پتھر کس نے

کم نصیبی کا اندھیرا تھا مرے چاروں طرف
اس طرح آکے جگایا ہے مقدر کس نے

میں نے کھائی تھی قسم آہ نہ کرنے کی کبھی
”دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے“

بس کہ تدبیر تھی مٹھی میں مری اے شہزادؔ
پھر چلایا مری امید پہ خنجر کس نے

سید نفیس دسنوی (کٹک)

موبائل۔9437067585

اس طرح پالیا قدرت سے یہ جوہر کس نے
ایک کنکر کو بنا ڈالا ہے گوہر کس نے

قوم کی قوم تھی زندانِ جہالت میں اسیر
کردیا علم کے دریا کا شناور کس نے

جن کے ہاتھوں کو ضرورت تھی قلم کاغذ کی
ایسے بچوں کو تھمایا ہے یہ خنجر کس نے

کس نے دی ہے یہ ہوا شعلۂ نفرت کو یہاں
کردیا دیش کا ماحول مکدر کس نے

ایک ذرّے سے بنایا ہمیں اشرف کس نے
اے نفیسؔ آپ کا رتبہ کیا برتر کس نے

محمد عبدالقدیر طاہر (کریم نگر)

موبائل۔9700969840

کھول کر رکھ دیا یہ عقدۂ ساغر کس نے
بند کوزے میں کیا سارا سمندر کس نے

سامنے آکے مری جان بھی لے سکتا تھا
آہ! گھونپا ہے مری پیٹھ پہ خنجر کس نے

میں اکیلا ہوں، اکیلا ہی سفر کرتا ہوں
فردِ واحد کے لیے بھیجا ہے لشکر کس نے

بٹ گئی یار کی تصویر کئی لہروں میں
”دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے“

ہے خدا کاتبِ تقدیر سبھی کا طاہرؔ
اپنے ہاتھوں سے لکھا اپنا مقدر کس نے

محمد یونس عاصم (ڈھنکانال (اڑیشا)

موبائل۔7735924890

مہ و انجم کا فلک کو دیا زیور کس نے
ریت کے سینے میں رکھا ہے سمندر کس نے

مجھ کو تا حدِ نظر زندگی مخدوش ملی
جانے اس شہر کا بدلا ہے یہ منظر کس نے

سازِ احساس کے تاروں میں مچی ہے ہلچل
”دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے“

فیصلہ وقت پہ چھوڑو یہ جھگڑنا کیسا
تم نہ دیکھو کہ کیا ظلم یہ کس پر کس نے

آج پھر ہوش کا عاصمؔ ہوا ہے قتل یہاں
آج پھر دستِ جنوں کو دیا پتھر کس نے

نعمت رضوی (بھاگلپور، بہار)

موبائل۔9431675135

یوں دکھایا ہے مجھے جلوۂ انور کس نے
کردیا گوشۂ دل کو منور کس نے

ایسی قدرت ہے بھلا کس میں بتاؤ لوگو
پل میں دریا کو بنا ڈالا سمندر کس نے

بد نصیبی کے اندھیرے میں پڑا تھا کب سے
پھر سے چمکا دیا یہ میرا مقدر کس نے

اب یہاں پیار کی برسات نہیں ہوتی ہے
دل کی وادی کو بنا ڈالا ہے بنجر کس نے

میں نہیں جانتا یہ کس کا کرم ہے نعمتؔ
میں تو واعظ ہوں بنا ڈالا سخنور کس نے

حمید عکسی (ورنگل)

موبائل۔900071916

پرسکوں میں تھا مجھے کردیا مضطر کس نے
”دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے“

میرے پیچھے تو سبھی دوست نظر آتے ہیں
کچھ تو معلوم ہو پھینکا ہے یہ پتھر کس نے

میری آنکھوں سے بہے اشکِ ندامت جس دم
ان کی بوندوں کو کیا قیمتی گوہر کس نے

کس نے بھڑکایا ہے نفرت کا یہاں پر شعلہ
خون آلود کیا شہر کا منظر کس نے

ظلمتِ کفر تھی حاوی مرے دل پر عکسیؔ
کردیا اس کو اجالوں سے منور کس نے

ساغرملارنوی (راجستھان)
فون۔(07466-52115)

آسماں پہ کیسے روشن مہہ واختر کس نے — بحر و برکو بھی کیا ہے یوں مسخر کس نے
شیشۂ دل پہ مرے مارا ہے پتھر کس نے — ریزہ ریزہ کی ہے تہذیب کی چادر کس نے
پھونک ڈالا وہ مرا شہرِ حسیں تر کس نے — "دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے"
اک اسی رب کا ہی فیضانِ نظر ہے سب پر — وقت کا مجھ کو بنایا تھا سکندر کس نے
کیا اڑانا تھا مری تشنہ لبی کا یوں مذاق — ہاتھ سے چھین لیا ساقی کے ساغر کس نے

نفیس سیتاپوری (یوپی)
موبائل۔9151387351

آج پھر یاد کیا ہے مجھے پل بھر کس نے — رکھ دیا میری رگِ جاں پہ یہ نشتر کس نے
برق نے صاف کہا اس میں مرا ہاتھ نہیں — اے نگہبان بتا پھونکا مرا گھر کس نے
میکدے بن کے سوالی رہے جن آنکھوں کے — ایسی جھیلوں کو رقم کردیا ساغر کس نے
کس نے آئینہ اس انداز سے ٹکرایا ہے — توڑ ڈالا مرے احساس کا پتھر کس نے
کیا کبھی سنگی بتوں نے بھی یہ سوچا ہے نفیس — ایک پتھر سے بنایا تجھے شنکر کس نے

ناظمہ پروین حنا
پٹنہ۔۴

خون آلود دکھایا مجھے منظر کس نے — "دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے"
تشنہ لب ایسا تو میں نے کہیں دیکھا بھی نہیں — پی گیا آج یہاں سارا سمندر کس نے
قافلہ والوں کی تقدیر میں لُٹنا ٹھہرا — ایک رہزن کو بنا ڈالا ہے رہبر کس نے
طبعِ موزوں بھی نہیں، فکر نہیں، فن بھی نہیں — رکھ دیا نام مگر میرا سخنور کس نے
کس نے مہکائی حنا اپنی غزل کی خوشبو — بزم کو کردیا یوں آکے معطر کس نے

سعید رحمانی
کٹک

چاند تاروں کو اُگایا ہے فلک پر کس نے — ساری دنیا کو کیا ایسا منور کس نے
آگ یہ کس نے لگائی ہے عداوت کی یہاں — خون سے سرخ کیا شہر کا منظر کس نے
میں اجالوں کے تعاقب میں چلا تھا لیکن — کردیا پیچھے مرے رات کا لشکر کس نے
دائرے کرب کے بنتے گئے چہرے پہ مرے — "دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے"
کم نصیبی رہی مدت سے مرے ساتھ سعید — پھر سے بیدار کیا میرا مقدر کس نے

مجید ساجد بھڑگانوی
مالیگاؤں۔موبائل۔9270592238

علم کے بحر میں دیکھا ہے اتر کر کس نے — اس کی تہہ سے بھی نکالا کبھی گوہر کس نے
ایک ہلچل سی مچادی مرے اندر کس نے — "دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے"
میں نے دشمن کو دکھائی تو نہیں پیٹھ کبھی — پھر مری پُشت پہ مارا ہے یہ خنجر کس نے
جن کے دل میں نہیں احساس غمِ مفلس کا — ایسے لوگوں کو دیا نامِ تونگر کس نے
دل کے کاغذ پہ لکھی تیری غزل ہے ساجد — پڑھ کے ہر شعر ترا کرلیا ازبر کس نے

مقصود اشرف (مالیگاؤں)
موبائل۔9373226855

"دل کے تالاب میں پھینکا ہے یہ کنکر کس نے" — رکھ دیا ہے مری ہستی کو ہلا کر کس نے
جس طرف دیکھیے رحمت کی گھٹا چھائی ہے — آج مانگی ہے دعا اشک بہا کر کس نے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تری یادوں کے چراغ — آکے چپ کے سے جلایا مرے اندر کس نے
رنگ اور نسل کی دنیا سے مٹا کر تفریق — سب کو اک صف میں کیا لاکے برابر کس نے
تم بھی مقصود عجب پوچھتے رہتے ہو سوال — مجھ کو دنیا میں بنایا ہے سخنور کس نے

باقی صفحہ 65 پر

حفیظ فاروقی (کریم نگر)

حفیظ انجم مرحوم کو طرحی خراجِ عقیدت پیش کردہ۔حفیظ فاروقی۔کریم نگر

دبستانِ سخن کی اب کہاں وہ شان باقی ہے
بہاریں ہوگئیں رخصت چمن ویران باقی ہے
وہی مانوسِ دستک در، مہکتا لان باقی ہے
چلے آؤ حفیظ انجم ابھی ریحان باقی ہے
خطا کیا کچھ ہوئی مجھ سے نہ روٹھو آکے بتلا دو
لو پکڑا کان میں اپنے تمہارا مان باقی ہے
جریدے یاد کرتے ہیں، رسالے یاد کرتے ہیں
سخن پرور ہوئے رخصت مگر پہچان باقی ہے
ذرا رضواں سے کہہ دینا، درِ جنت کو وا رکھے
حفیظِ سست رو وہ کاتبِ[1] دیوان باقی ہے

شعرائے کریم نگر جو قلیل عرصے میں اس سرائے فانی سے کوچ کر گیے

یارانِ بے مثال ہنرور چلے گیے — تمکین کے فراق میں رہ کر چلے گیے
حامد چلے گیے تھے کہ انور چلے گیے — غمگین دل کو تھام کے رہبر چلے گیے
غمگین دل کو تھام کے رہبر چلے گیے — انجم لگا کے نام پہ ہنٹر چلے گیے
انجم لگا کے نام پہ ہنٹر چلے گیے — وہ معتبر معزِ سخن ور چلے گیے
جاتے کہاں ہیں دیکھنے گوہر چلے گیے — بزمِ سخن کو ڈھونڈتے منظر چلے گیے
میر و امیر و غالب و اختر چلے گیے — انجم تھے با شعور سمجھ کر چلے گیے
بزمِ سخن سے نعت سنا کر چلے گیے — اخبار میں خبر ہے کہ اظہر چلے گیے
تم بھی چلو حفیظ تمہاری ہے کیا بساط — پرکیف زندگی کے قد آور چلے گیے

۱۔تمکین آفاقی ۲۔حامد کریم نگری ۳۔انور کریم نگری ۴۔رہبر کریم نگری ۵۔ڈاکٹر خان انجم ہنٹر ۶۔معز کریم نگری ۷۔گوہر کریم نگری ۸۔منظر لطیفی ۹۔حفیظ انجم کریم نگری ۱۰۔اظہر قادری

ادب پیما

(ادبی' تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں)

ادارۂ سوغات نظر کے زیر اہتمام عید

عید' مسرت وشادمانی کا پیغام دیتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کے انعام کے طور پر عید کا دن عطا کیا' عید ان کی ہے جنھوں نے روزے رکھے' قرآن کی تلاوت کی اور راتوں میں قیام کیا۔عید کے موقع پر غرباء ومساکین کو زکوٰۃ وفطرہ کی ادائیگی کے ذریعہ انھیں اپنی خوشیوں میں شامل کرنا اللہ کی خوشنودی کا ایک بہترین ذریعہ ہے ۔عید ملاپ تقریب بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کا مظہر ہے۔مشاعرے اردو کی ترقی اور ترویج کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔اس میں نئی نسل کو اردو زبان سے واقف کروانے کی طرف بھرپور توجہ کی ضرورت ہے۔ان خیالات کا اظہار دانشوارنِ شعر وادب نے ادارۂ سوغات نظر اور حبیب نگر کلچرل فورم کی جانب سے منعقدہ عید ملاپ مشاعرہ میں کیا جو حبیب نگر کمیونٹی ہال مالے پلی میں منعقد ہوا تھا۔صدارت ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے کی۔مقررین میں ڈاکٹر محبوب فرید' ثناء اللہ خاں اور این غوری شامل تھے۔ابتداء میں صدرِ فورم جناب محمد احمد نیشر کا کا خیر مقدم کیا۔اس تقریب کے معاونین میں محمد نصر اللہ خان' عطا حسین' زبیر خاں و دیگر شامل تھے۔مولانا ارشد حنفی کی تلاوتِ کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔اول انھوں نے مولانا محمد حمید الدین عاقل جامیؔ کی نعت پیش کی۔ناظمِ اجلاس و مشاعرہ جناب مومن خان شوق معتمدِ عمومی ادارہ سوغات نظر نے کاروائی چلائی۔تقریب کے فوری بعد ممتاز شاعر وصحافی جناب مسعود ہاشمی کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔مہمانِ خصوصی جناب صادق نوید، صاحبزادہ مجتبیٰ فہیم' جناب کامل حیدرآبادی کے علاوہ سرس سرداراثر 'مومن خان شوق' شاہ نواز ہاشمی' شکیل حیدر' ڈاکٹر نعیم سلیم' عارف رسا' افتخار عابد' مجیب شاہ پوری نے کلام سنا کر داد وتحسین حاصل کی۔عقیل بیابانی نے نعتیہ کلام پیش کیا۔اس تقریب میں باذوق سامعین نے کثیر تعداد میں شرکت کی تھی۔آخر میں مومن خاں شوق کے شکریئے پر عید ملاپ' تقریب ومشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

ظہیر آفاق کو "شہرۂ آفاق" کا خطاب
محفل شعروادب اور کتابوں کا اجراء

ہفتہ کی شام اردو اکاڈمی تامل ناڈو کے زیر اہتمام "محفل شعروادب" اور کتابوں کی رسم رونمائی منعقد ہوئی۔پروفیسر عبدالرحمٰن احساس نے صدارت فرمائی اور پروفیسر حیات افتخار نے رسمِ اقبال مندی پیش کی۔جناب آفاق کی پچاس سالہ اردو زبان وادب کی خدمات کے اعزاز میں اردو کلب' مدراس کی جانب سے انھیں "شہرۂ آفاق" کے خطاب سے نوازا گیا۔اس خطاب کی اقبال مندی عمل پذیر ہوئی۔موصوف کی دو کتابوں "آہنگ گل افشاں" (نثری) اور "عزم جواں" (شعری) کا اجراء عمل میں آیا۔جناب محفوظ رنجش نے شعری نشست کا آغاز کیا جس میں محترم عثمان غنیؔ' محمد اسحاق عابدؔ' عبیدالرحمٰن احساسؔ' رشید سحرؔ قابل ذکر ہیں۔پروفیسر حیات افتخار نے اردو میں گیتوں پر مقالہ پیش کیا۔غنی صاحب نے "اسلام پر فتنے ٹوٹے" کے عنوان سے دردانگیز حقیقت پیش کی۔اور جلسہ کے اختتام پر اظہار تشکر سے سامعین کی خدمت میں سپاس گزاری پیش کی۔(پریس نوٹ محسن زیدی۔اردو اکاڈمی، تامل ناڈو۔)

امتحان میں بانو مہر سلطانہ کی شاندار کامیابی

محمد حمید الدین احمد ناز صاحب (مقیم بیدر' کرناٹک) کی صاحب زادی بانو مہر سلطانہ نے امسال بارہویں جماعت میں امتیازی نمبر کے ساتھ سکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوکر اپنے خاندان کا نام روشن کیا ہے۔ادارہ ادبی محاذ اس کامیابی پر بانو مہر سلطانہ کو مبارباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ اللہ انھیں ترقیٔ درجات کے ساتھ درازیٔ عمر عطا فرمائے۔ان کی تعلیمی پیش رفت جاری رہے۔امید ہے کہ آگے چل کر وہ مزید بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گی۔

چھتیس گڑھ اردو تنظیم کے زیر اہتمام جشنِ عید ملن

عید ملن کا یہ جشن گڑھیادی میں واقع رائے پور کانونٹ اسکول کے ہال میں منایا گیا جس کی صدارت ہندی کے بزرگ شاعر برج کشور چنچل صاحب نے فرمائی۔انجینئر امرناتھ تیاگی صاحب بطور مہمانِ خصوصی جلوہ افروز تھے۔اردو اور ہندی شعرا نے کثیر تعداد میں شرکت کر کے قومی یکجہتی کا خوشگوار منظر نامہ پیش کیا۔آپس میں گلے مل کر سبھوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔گوہر جمالی صاحب کے بچوں نے مہمانوں کی شیر خورمہ سے تواضع کی اور دعائیں لیں۔کچھ مہمانوں نے ان بچوں کو عیدی بھی دیے۔اس کے بعد مشاعرہ ہوا جس کے چند منتخب اشعار پیش ہیں:

کوئی رنجش نہ شکوہ گلہ عید میں۔دشمنوں سے بھی کیجئے وفا عید میں (گوہر جمالی)

بیر کی باتیں بھلانی چاہیے۔امن کی فصلیں اگانی چاہیے (ڈاکٹر منجولہ سریواتو)

خوشیوں کا جام لے کے دنیا میں عید آئی
یکتا کی شام لے کے دنیا میں عید آئی (شریمتی شیوا باجپائی)

پریم اور سوہارد کا گھر گھر پھیلا نور۔ منظر ہے یہ عید کا ہر کوئی مسرور (انیل کمار زاہدؔ)
سب کے سپنے ہو جائیں سا کار۔ عید میں یارب کر دے تو اپکار (شریمتی شیوانی مترا)
من میں آتا ہے مرے بھی مسکرانے کا خیال
پر اجازت ہی نہیں دیتا کمانے کا خیال (شیخ نظام راہی)
دل کی چنگاریاں آہوں سے بھڑک جاتی ہیں
بھٹیاں جیسے ہوا پا کے دہک جاتی ہیں (عالم نقوی عالمؔ)
محبت کے جس انداز کا اظہار ہیں آنکھیں
نہ ہو شرم و حیا کا رنگ تو بیکار ہیں آنکھیں (عبدالسلام کوثرؔ)
کہیں ست سنگ، بھجن، کیرتن، کہیں ہے نعت، قوالی
یہاں کے لوگ مل جل کر مناتے عید دیوالی
(یوسف ساگر، بھلائی)

ان کے علاوہ برج کشور چنچل، ہرش کمار سریواستو، ایم۔ ایل وید، شریمتی رادھا ڈھنگے، یشونت یدو، ایس۔ جی۔ ربانی، پرکاش منگلیش، پورن جیسوال، مول چند شرما، رام نرائن ساہو نے بھی کلام پیش کیے اور آخر میں گوہر جمالی کے ہدیۂ تشکر پر اس شاندار جشن کا اختتام ہوا۔ (مرسلہ۔ گوہر جمالی)

یومِ آزادی کی مناسبت سے اردو اسکول حوض رانی میں پرچم کشائی

نئی دہلی: یوم آزادی کی مناسبت سے جنوبی دہلی کے ساؤتھ زون 23 وارڈ نمبر 162 حوض رانی میں واقع میونسپل کارپوریشن کے اردو اسکول میں تقریبِ پرچم کشائی کی گئی۔ جس میں پی ٹی اے سکریٹری و صدر تعمیر ملت فاؤنڈیشن مرزا ذکی احمد بیگ و پرنسپل نزاکت علی نے ترنگا پھیرایا۔ اس موقع پر زیر تعلیم طلباء و طالبات نے ثقافتی پروگرام پیش کئے اور داد و تحسین وصول کی ۔سیشن اور 2016 کے اول اور دوم وسوم پوزیشن کے طلبہ کو انعامات سے بھی نوازا گیا، انعام پانے والی بچیوں میں عافیہ حبیب سیفی، زینب فاطمہ، ستارے بابو، ثانیہ صدیقی، اقراء ذکی احمد کے نام شامل ہیں۔ پرچم کشائی کی تقریب سے قبل مہمان خصوصی نے آزادی کے تناظر میں خطاب کیا اور شہیدان وطن کو سلام پیش کیا۔ قومی اتحاد اور ملکی سالمیت پر مبنی دلوں کو مسحور کرنے والے ترانے بھی بچوں نے پیش کئے ۔اس موقع پر متعلقہ اسکول کے اساتذہ و استانیاں موجود تھیں جن میں نادرہ خان، ثمینہ اقبال، عابدہ، سونیا، محمد عمران، کلام سر، قیصر میڈم و دیگر نے بھی حصہ لیا۔

پنچکولہ، ہریانہ میں آل انڈیا مشاعرہ اور کوی سمّیلن

گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار احساس ادبی سوسائیٹی کی جانب سے پنچکولہ میں اس مشاعرے اور کوی سمیلن کا انعقاد گزشتہ ۳/اپریل کو ہوا جس کی صدارت لیفٹننٹ جنرل شری بی۔ کے۔ این چھبّر (سابق گورنر پنجاب) نے فرمائی۔ ڈاکٹر آمود گپتا (سابق پی۔ جی۔ آئی ہریانہ) بطور مہمانِ اعزازی جلوہ افروز تھے۔ ہماچل پردیش، پنجاب اور ٹونک (راجستھان) سے تشریف لائے مہمان شعرا کا تعارف سوسائیٹی کے صدر شری بی۔ ڈی۔ کالیہ ہمدمؔ نے کرایا۔ سابق گورنر شری چھبّر کے دستِ مبارک سے دو کتابوں کا اجرا بھی ہوا۔ یہ دو کتابیں تھیں:
(۱) ادبی جائزے۔ مصنف۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی (۲) آبشارِ ادب (تبصراتی جائزے)
مشاعرے سے پہلے بزمِ موسیقی کے تحت غزل سرائی کا پروگرام ہوا جس میں محترمہ گورمیت کور اور آر۔ ڈی۔ کیلے نے بی۔ ڈی کالیہ ہمدم کی غزلیں پیش کیں۔ مشاعرے میں شریک شعرا کے اسمائے گرامی ہیں:۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی (ٹونک)، ضمیر علی ضمیرؔ (مالیر کوٹلہ)، بی۔ ڈی۔ کالیہ ہمدم (ہریانہ)، وجیندر غافلؔ (ہریانہ)، کراپ دانش، تروڑاں وششٹ، کشور کمار ودروہی، گورمیت کور (پنجاب)، ڈاکٹر نریش (ہریانہ)

محفلِ گنگ وجمن کے تحت عام قلمکاروں کیلئے غالب اکیڈمی میں ایک پروگرام

زمین و آسماں کی ترجماں ہے ☆ غزل سارے جہاں کی ترجماں ہے

غالب اکیڈمی نئی دہلی میں اردو ہندی اور پنجابی کے قلمکاروں پر مشتمل سہ لسانی ادبی تنظیم محفلِ گنگ وجمن کی جانب سے ادبی پروگرام منعقد کیا گیا جسکی صدارت عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمٰن نے فرمائی اور نظامت سینئر ایگزیکٹیو ادیب ڈاکٹر ظفر مرادآبادی نے کی۔ پروگرام کے آغاز پر ایگزیکٹیو شاعر و صحافی حبیب سیفی نے شرکاء سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ شاعری کے ساتھ نثری تخلیق بھی پیش کرنے کی آج کھلی اجازت ہے، کسی قسم کی پابندی کسی پر نہیں ہے اور ڈائس سے کوئی بھی آ کر اپنی تخلیق پیش کر سکتا ہے، آج کا یہ پروگرام گنگ وجمن کے ممبروں تک ہی محدود نہیں ہے، یہ پیشگی اطلاع اخبارات میں پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی تنظیم کے ممبرس قلمکاروں کے علاوہ

دیگر قلمکاروں نے بھی اس میں حصہ لیا اور (یادکر وقربانی) یومِ آزادی کے تناظر میں بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ڈائس پر اردو کی نمائندگی کیلئے ذہینہ صدیقی، ہندی کیلئے تارا چند شرما نادانؔ اور میناکشی ججی ویشا پنجابی کی نمائندگی کیلئے موجود تھیں، جنہوں نے اپنے کلام سے بھی نوازا۔ پروگرام کے تعلق سے صدر نے گنگ وجمن کے ذریعے لکھنے والوں کو مواقع فراہم کرنے اور تنظیم میں آئی اچھی تبدیلیوں کو نیک شگون قرار دیا، تنظیم سے نئی نسل کو جوڑنے اور گنگ وجمن کا دائرہ وسیع ہونے پر مبارکباد دی۔ پسند کئے گئے اشعار کا نمونہ درج ذیل ہے۔

زمین وآسماں کی ترجماں ہے۔غزل سارے جہاں کی ترجماں ہے(ڈاکٹر جی آر کنول)

وہاں پر دل جگر کی بات بھی سنتا نہیں کوئی
یہاں پر مسئلہ ہی اصل میں دل اور جگر کا ہے(اے رحمٰن)

مجھے ہوش کب ہے کہ سن سکوں دل خودنگوں کی حکایتیں
مرے سامنے مری داستاں کوئی تھا سنانے چلا گیا(انور غازی آبادی)

چمیلی اور جوہی سے تو بس گلدان مہکے گا
جو ہم تم مل کے بیٹھیں گے تو ہندوستان مہکے گا (آصف نظر)

پھر ایک میرؔ کی درکار ہے زمانے کو
چراغ شعروادب خون سے جلانے کو(حلیم زیدی)

ہمارے حق میں جن کو بولنا تھا۔وہ غیروں کی وکالت کررہے ہیں (اجےئ عکس)

حاکم وقت کا فرمان زباں بندی ہے۔ طائرِ فکر کو آزاد نہ رکھا جائے (اسرار رازی)

حوصلے جب فاصلوں سے بھی بڑے ہوجائیں گے
راستے پھر خود چلیں گے ہم کھڑے ہوجائیں گے (ایازؔ ہاپوڑی)

ہم نے نفرت سے کوئی جنگ جیتی ہی نہیں
ہم گزرتے ہیں جدھر سے وہ ہمارا ہوجائے (نزاکت امروہوی)

زندگی صدیوں نہیں پاتا کوئی۔لاکھ لے کوئی دعائیں پیر کی (دلدار دہلوی)

مری صحبت میں آبندگی سیکھ لے۔کیوں مرا جارہا،کافری کے لئے (راجیو پراشر)

بھٹک جائیں گے وہ آخر۔کئی جن کے ٹھکانے ہیں (ناگیش چندرا)

اس موقع پر موجود ممبرس اور مہمان شعراوشاعرات میں وقار مانوی،محمد افضال حسین،محمد عثمان غنی،مسز ینت احسان قریشی،شمس رمزی،نغمہ بریلوی،ہلال بدایونی،عبدالواجد سیفی،جنید،احترام صدیقی،عرفان احمد،نمیتا راکیش، متین امروہوی، نریندر شرما،راز سکندر آبادی، پرتبھا روہتگی فرید آبادی،آشیش سنہا قاصد،معین اللہ، رام شیام حسین،احمد علی منصوری،سید ایم حیدر،حلیم زیدی،رحمٰن منصور، بھارت بھوشن آریہ،درگیش اوستھی ،منوج بیتاب،انوار احمد،وشال باغ،چندر کانتا سیوال،محمد حسنین علی،گجیندر پرتاپ،مطلوب عالم،راجکمار راج،محمد جوہر علی،سورن سنگھ وسیر،غفران آفریدی،ضمیر ہاپوڑی، چشمہ فاروقی، ایم ایل گرگ،خالد احمد، اسلم بیتاب،راجیو ریاض وغیرہ نے شرکت کی،اپنا کلام پیش کیا،اور پروگرام کو کامیاب بنایا۔

تصحیح

گزشتہ شمارے میں حضرت کبیر وارثی کی جو غزل صفحہ ۳۰؍ پر شائع ہوئی ہے اس کا مطلع غلط چھپ گیا ہے۔درست مطلع اس طرح ہے:

درِ وارث ملا قسمت کھلی ہے۔کرم کی مجھ پہ بارش ہورہی ہے

دوسری غزل جو صفحہ ۳۱؍ پر ہے اس کا چوتھا شعر حزف کرکے پڑھیں